سوز خوانی کا فن
عقیل عباس جعفری
ورثہ

التماس سورۂ فاتحہ

برائے ایصال ثواب

سید نوازش علی نقوی

ابن سید حسین احمد نقوی (مرحوم)

سیدہ حسن بانو (چاندی)

بنت سید اختر حسین زاہدی (مرحوم)

سیدہ شمیم زہرا نقوی

بنت سید نوازش علی نقوی (مرحوم)

شہید سید قمر رضا نقوی

ابن سید نوازش علی نقوی مرحوم

شہید اسد رضا نقوی

ابن شہید سید قمر رضا نقوی

سید سلمان رضا نقوی

ابن شہید سید قمر رضا نقوی

سید علی حسنین زیدی

سیدہ خورشید حسنین زیدی

شہید پروفیسر سبطِ جعفر زیدی

شہید سید سعید حیدر زیدی

و

جملہ مومنین و مومنات و شہدائے ملت

دعا فرمایئے کہ

پروردگار عالم چہاردہ معصومین کے صدقے میں

مرحومین کے درجات بلند فرمائے

اور انکو جوار آئمہ معصومین میں جگہ عطا فرمائے

اور ان کی تمام لغزشوں اور کوتاہیوں کو درگزر فرمائے۔

عقیل عباس جعفری

قانونی مشیر: قادر خان لا ایسوسی ایٹس، کراچی۔

سرورق: "Shi`a Muslims Mourning Before A Ta`ziya" c 1800, Lucknow. Chester Beatty Library

کمپوزنگ / لے آؤٹ ڈیزائننگ: برکت علی

اشاعت اوّل: 2020ء

قیمت: =/300روپے

اہتمام اشاعت: [illegible] پبلی کیشنز،

1/94-26ویں اسٹریٹ فیز6، ڈی ایچ اے، کراچی

فون: 0300-9242098

ای میل: aqeelabbasjafri@gmail.com

تقسیم کار: فضلی بک سپر مارکیٹ۔

507/3، ٹیمپل روڈ، اردو بازار، کراچی۔

سبط جعفر زیدی کے نام

سید سبط جعفر زیدی ۷ مارچ ۱۹۵۷ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا سید احمد میاں زیدی ایک عالم دین تھے۔

سبط جعفر زیدی نے نہایت کم عمری میں مجالس عزا میں پیش خوانی سے شہرت حاصل کی۔ انھوں نے استاد معشوق علی خان سے سوز خوانی کی تربیت حاصل کی اور بہت جلد پاکستان کے معروف سوز خوانوں میں شمار ہونے لگے۔

سبط جعفر زیدی نے سوز خوانی کے فن کو فروغ دینے کے لیے ادارہ ترویج سوز خوانی کے نام سے ایک تنظیم قائم کی اور بستہ کے نام سے سوز خوانی میں پڑھا جانے والا کلام مرتب کیا جو سوز خوانی کے فروغ میں بہت معاون اور مددگار ثابت ہوا۔ سبط جعفر زیدی کے شاگرد پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور سوز خوانی کے فن کو فروغ دے رہے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ سبط جعفر زیدی تمام حلقوں میں استاد کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔

سبط جعفر زیدی نے صوتی علوم وفنون اسلامی کے نام سے ایک کتاب تحریر کی جس میں سوز خوانی کے ساتھ ساتھ ان تمام علوم کا بھی جائزہ لیا گیا تھا جن کا تعلق لحن سے ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کی کئی تصانیف ہیں جن میں نوحہ از آدم تا ایں دم کا نام سرفہرست ہے۔ ان کی تصانیف میں سے چند تصانیف نصابی موضوعات پر ہیں۔ انھوں نے حجاج کرام کے لیے ایک رہنما کتاب زاد راہ کے نام سے تحریر کی تھی۔

سبط جعفر زیدی ایک عمدہ شاعر بھی تھے اور ان کی شاعری کے کئی مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں، جن میں کربلا میں رہتا ہوں کا نام سرفہرست ہے۔

سبط جعفر زیدی ایک متحرک سماجی شخصیت تھے۔ وہ متعدد تنظیموں کے ساتھ عملی طور پر منسلک رہے جن میں انجمن وظیفۂ سادات و مومنین اور جعفریہ ڈزاسٹر سیل کے نام سرفہرست ہیں۔

سبط جعفر زیدی کراچی کے ایک کالج سے بطور پرنسپل منسلک تھے۔ ۱۸ مارچ ۲۰۱۳ء کو کراچی میں دہشت گردوں نے انھیں فائرنگ کر کے شہید کر دیا۔ سبط جعفر زیدی کی تاریخ شہادت ''آرزو مند شہادت استاد سید سبط جعفر زیدی'' کے جملے سے نکلتی ہے اس جملے کے اعداد کا مجموعہ ۲۰۱۳ ہے جو ان کا سن وفات ہے۔ وہ وادی حسین کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔

ایک نادر تصویر

اراکین انجمن سوزخوانان پاکستان ۱۹۶۸ء

فرش پر دائیں سے بائیں۔ کاظم رضا، انصار حسین، نوراللہ، خورشید حسن، مظاہر کاظمی (منظر عباس سلمہٗ)، فائق حسین، علی ناصر، تنویر حسنین، جعفر رضا۔ بیٹھے ہوئے: حشمت حسین، آغا داؤد مرزا، آغا مسعود مرزا، مختار حسین نقوی، آفتاب علی کاظمی، رضی حسن خان، آباد محمد نقوی، معشوق علی خاں حیدری، اختر وصی علی۔ کھڑے ہوئے: رضا پنجتن سلمہٗ، محمد میاں سلمہٗ، محمد عباس سلمہٗ۔

تعارف

رثائی ادبیات کی جب بھی کوئی مستند اور جامع تاریخ قلم بند کی جائے گی اور فنی رموز بھی زیر بحث آئیں گے تو فن سوزخوانی کو پس پشت نہیں ڈالا جا سکے گا۔ مرزا دبیر کے استاد میر ضمیر کا تذکرہ کرتے ہوئے موازنہ انیس و دبیر میں شبلی نے لکھا ہے کہ اب سے پہلے مرثیے سوز کے لہجے میں پڑھے جاتے تھے۔ اس رائے کے پیش نظر سوزخوانی کی اولیت سے انکار ممکن نہیں۔ اسی لیے بعض اہل فن نے اسے مجلس عزا کی تکبیرۃ الاحرام بھی قرار دیا ہے۔

وہ اصناف ادب و فن جن کا تعلق کسی نہ کسی زاویے سے مذہب کے دائرے میں آجاتا ہے ان پر ہمارے نقادوں اور اہل تحقیق نے توجہ نہیں کی۔ اس کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایسے میں فن سوزخوانی جس بے دردی سے نظر انداز ہوا اس کی مثال نہیں ملتی۔ سوزخوانوں کے حالات پر مشتمل کچھ کام ہوا تو ہے اور پھر چند متفرق مضامین بھی ہیں اور بس، باقی ہاتھ جھاڑ کر کھڑے ہو جائیے۔ ایسی مایوس کن صورت حال میں جناب عقیل عباس جعفری نے بیڑا اٹھایا اور اس صنف عزا کی تاریخ مرتب کر دی۔

سوال یہ ہے کہ فن سوزخوانی کی کوئی تاریخ اتنی تاخیر سے کیوں مرتب ہو رہی ہے! اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ جو ادارے اور مراکز تحقیق کا منبع ہوتے ہیں وہاں اس حوالے سے علمی اور تحقیقی کاموں کی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ اگر میں کسی بھی تکلف اور احتیاط کو ایک طرف کر کے بات کروں تو دیانت دارانہ حقیقت تو یہی ہے کہ ہمارے تعصبات نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ادب وہ واحد تہذیبی رویہ ہے جو ہمیشہ انسانیت کی ترویج و فروغ میں آگے آگے رہا ہے لیکن افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ ادبی حلقوں نے بھی انسان کو تقسیم کر دیا ہے۔ کربلا کسی گروہ یا فرقے کا مسئلہ نہیں ہے۔ کربلا، صداقت، شہادت اور انکار بیعت کی سرخیوں سے عبارت ہے۔ مرثیہ، سلام اور سوز، اسی کربلا کے لیے خراج کی ایک دنیا لے کر آیا۔ شعرا نے اس میں فنی کمالات پرو دیے جو حزنیہ مضامین میں ایک نیا جادو جگانے لگے۔ مجلس کا آغاز سوز سے ہوا اور جب ماہرین فن اور مستند اساتذہ نے اس میں اپنی آواز کا درد سمویا تو اس نے دلوں میں جگہ

بنانا شروع کر دیا۔ کسی ماہر سوز خواں سے کربلا کی داستان کا کوئی دردسن کر دیکھیے۔ انسانی احساس میں روح دوڑنے لگے گی۔

المیہ یہ ہے کہ سوز خوانی کو سنجیدگی سے فنی تربیت کے آئینے میں دیکھا ہی نہیں گیا۔ اس فن کی ہنر آرائی اسی وقت کچھ کچھ سمجھ میں آسکتی ہے، جب اسے مجلس عزا میں سنا جائے۔ میں کراچی میں رہتا ہوں، عقیل عباس جعفری بھی اسی شہر میں زندگی گزار رہے ہیں۔ انھوں نے بھی دیکھا ہوگا کہ جب ڈاکٹر یاور عباس کے گھر کی مجالس نو تصنیف مرثیہ میں شوکت تھانوی سے زیڈ اے بخاری تک اور نسیم امروہوی سے سید آل رضا تک انتہائی منتخب سامعین کے روبرو آغاز مجلس میں سوز خوانی کا بستہ کھلتا تھا تو کیا کیا کمالات ظاہر نہیں ہوتے تھے۔ اختر وصی علی سے معشوق علی خاں اور پھر عظیم الحسن سے آباد محمد نقوی اور پھر اب جواں سال نسل میں مرحوم سبط جعفر تک، اس کی جو تاریخ بنتی گئی وہ بہت اہمیت کی حامل ہے۔ ۱۹۷۱ء میں جب میں بالکل نوجوان تھا، میں نے حسینیہ انجمن ایرانیان میں جوش ملیح آبادی کو دیکھا کہ وہ عظیم الحسن صاحب کی سوز خوانی کو پوری توجہ سے سن رہے تھے۔ یہاں انھوں نے مرثیہ پانی پیش کیا تھا۔ ان کی پیش خوانی کا شرف مجھے حاصل ہوا تھا۔ (بات کسی اور طرف نہ چلی جائے)۔ میں عرض یہ کر رہا ہوں کہ انیس سے جوش تک ہر عہد کے بڑے شعرا نے سوز خوانی کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ سوز خوانوں نے سلام، رباعیات اور مرثیے کے انتخاب سے اپنے فن کی دنیا تعمیر کی۔ سوز خوانی ادب و فن دونوں کی ترویج کا نام ہے۔ پیش نظر کتاب میں عقیل عباس جعفری نے اس فن کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔ میری ان سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی ہے، جس سے اندازہ ہوا کہ وہ اس حوالے سے اپنے کاموں کو ابھی بہت آگے لے کر جانا چاہتے ہیں۔

عقیل عباس جعفری ایک خوش گو شاعر ہیں۔ ان کی تحقیقی کاوشوں کا دائرہ تاریخ و سیاست سے ادب، فرہنگ نگاری اور حوالہ جاتی کاموں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس مختصر اظہاریے میں تفصیل کی گنجائش تو نہیں ہے۔ میں ان کے کاموں کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں خصوصاً اردو لغت بورڈ کے دور ادارت میں انھوں نے جس طرح اس ادارے کے جمود کو توڑا اور اس کے تن مردہ میں روح پھونکی وہ کچھ انھی کا حصہ ہے۔ ان کی یہ تازہ کتاب ''سوز خوانی کا فن'' ایک بہت سنجیدہ اور باوقار تصنیف ہے، جس نے ہماری ادبی و تہذیبی قدر میں بھی اضافہ کیا ہے۔

ڈاکٹر ہلال نقوی

۶ ستمبر ۲۰۲۰ء۔ کراچی

حرفِ آغاز

ظلم وزیادتی اور جبر وتشدد ہر عہد، ہر معاشرہ اور ہر طبقہ میں ناپسندیدہ اور معیوب ہی سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس کا آغاز حضرت آدمؑ ہی کے زمانہ سے اس وقت ہو گیا تھا جب قابیل نے ہابیل کو ناحق قتل کر دیا چنانچہ ظلم وتشدد کے ساتھ ہی ردعمل اور احتجاج کا آغاز ہو گیا چونکہ نثر پر نظم کو اور تحت پر لحن کو فوقیت اور عوامی پذیرائی حاصل رہی ہے۔ خصوصاً ہر طبقہ اور ہر عہد کے شعرا نے منظوم صدائے احتجاج بلند کی ہے کہ دل دردمند رکھنے والا کوئی بھی حساس انسان کسی جبر وزیادتی پر تادیر خاموش رہ ہی نہیں سکتا جبکہ اسلام نے تو اسے مذہبی تقدس وتحفظ عطا کر دیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ تم اگر کوئی برائی دیکھو تو اولاً اسے ہاتھ سے روکو ورنہ زبان سے اور یہی زبانی مزاحمت اور کلمہ حق بلند کرنا حق کی نصرت اور مظلوم کی حمایت لسانی یعنی جہاد باللسان قرار دیا گیا ہے۔

عربوں کو اپنی زبان دانی اور قدرت ومہارت زبان وبیان پر ناز تھا اور ایسا کہ اپنے سوا دوسروں کو عجمی یعنی گونگا گردانتے تھے اور یہ دعویٰ کچھ ایسا بے بنیاد بھی نہ تھا کہ لوگ منظوم گفتگو کیا کرتے تھے۔ شعر گوئی کی صلاحیت ومہارت بھی رکھتے تھے اور حافظہ بھی اور روزمرہ کے معمولات کو بھی نظم وحفظ کر لیا کرتے تھے ایسے ماحول میں جب واقعہ کربلا رونما ہوا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ خانوادۂ رسالت مآبؐ سے عقیدت وارادت رکھنے والے اس غیر معمولی واقعہ کو نظر انداز کر جاتے چنانچہ امام عالی مقام حضرت حسین علیہ السلام کی بہنوں حضرت زینبؑ و جناب ام کلثومؑ نے ان مصائب وشدائد اور مظالم وآلام کو شعری قالب میں ڈھال کر حسب موقع پیش کیا اور دوسرے شعرائے اہل بیت کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ اس سلسلے کا نقطۂ آغاز وہ سنانی ہے کہ جو بشیر ابن جزلمؒ نے اس لٹے ہوئے قافلہ کے کربلا کے مصائب اور شام وکوفہ کی اسیری ورہائی کے بعد مدینہ واپسی پر اہل مدینہ کو دی، واقعہ کے مطابق جب یہ کاروان مدینہ آیا تو اہل حرم نے مضافات مدینہ میں قیام کیا۔ اس موقع پر امام حسینؑ کے صاحبزادہ حضرت امام زین العابدینؑ نے

شریک قافلہ بشیر ابن جزلمؒ کو حکم دیا کہ وہ مدینہ والوں کو واپسی کی اطلاع کر دیں اور انھیں قبر رسولؐ اکرم و محلہ بنو ہاشم میں پہنچنے اور جمع ہونے کی دعوت دے دیں، چنانچہ بشیرؒ نے اس پیغام کو نظم و لحن میں پیش کیا اسی سنائی پر فارسی روضہ خوانی کی بنیاد رکھی گئی، اسی کو پنجابی سرائیکی طرز ذاکری کا نقطہ آغاز قرار دیا جاسکتا ہے اور اسے اردو زبان میں سواری اور نوحہ وسوز خوانی کے قالب میں ڈھالا اور پیش کیا گیا ہے، یوں برصغیر میں جو صنف عزا معرض وجود میں آئی وہ سوز خوانی ہی ہے یعنی سوز خوانی کربلا کے تعلق سے برصغیر اور اردو ادب کا اعزاز و امتیاز ہے، کلام کے اعتبار سے بھی اور ادائی کے لحاظ سے بھی۔

سوز خوانی نہ تو گویے کی گائیکی ہے اور نہ شاعر کا ترنم اس کو صرف لحن کہا جاسکتا ہے۔ لحن قدرت کا ایسا عطیہ ہے کہ اس نے اپنے ایک پیغمبر حضرت داؤدؑ کو عطا فرمایا اور اس لحن کو وہ تاثیر بخشی جس نے ایک معجزے کی صورت اختیار کر لی۔ ہر اچھے لحن کا نام ہی لحن داؤدی ہو گیا۔

سوز خوانی مجلس میں اس لیے ضروری ہے کہ یہ مجلس اور جلسے کے مابین امتیاز پیدا کرتی ہے۔ سننے والا اگر دور سے بھی سوز خوانی سنے تو وہ آسانی فیصلہ کر سکتا ہے کہ کہیں مجلس ہو رہی ہے جلسہ نہیں۔ دوسری ضرورت یہ ہے کہ ہر انسان فطرتاً تنوع پسند ہے، سوز خوانی سماعت کے لیے اس طرح تنوع مہیا کرتی ہے کہ سوز خوانی کی ابتدا میں مختلف مضامین پر مبنی رباعی یا قطعات پھر مکی سوز پھر سلام جو فضائل اور مصائب پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کے بعد مرثیہ جو محض مصائب سے تعلق رکھتا ہے۔ سوز خوانی کو اگر نماز عزا کی اذان واقامت سے تعبیر کریں تو بیجا نہ ہوگا۔

عزاداری جس خطہ ارض پر پہنچی اس نے وہاں کے رسم و رواج کا سہارا لیا۔ ہندوستان میں بھی عزاداری کی تبلیغ میں یہاں کے رسم و رواج کو ملحوظ رکھنا پڑا جس نے خاطر خواہ اپنا اثر دکھایا۔ لہٰذا حیدرآباد دکن سے "دوہے" کی صورت میں ابتدا ہوئی جس کو اشعار کی صورت میں ترنم میں پڑھا جاتا تھا جو کہ اس قدر دردانگیز اور رقت آمیز ہوتا تھا کہ سامع متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔

رفتہ رفتہ سوز خوانی مجلس عزا کا جزو لازمی بن چکی تھی۔ حیدرآباد (دکن) کے بعد دہلی، آگرہ، بہار، جے پور اور امروہہ اس فن کا مرکز بنے مگر جس بام عروج پر اسے لکھنؤ والوں نے پہنچایا وہ انھیں کا حصہ ہے جہاں سوز خوانی باقاعدہ ایک فن بن گیا۔ اس فن کی پہلی قدردان نواب بہو بیگم صاحبہ ملکہ عالیہ کو سمجھا جاتا ہے اور اس فن کے موجدین میں مولانا خواجہ حسن مودودی کا نام لیا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب مرحوم اگرچہ سنی المذہب تھے مگر سوز خوانی کے باکمال استاد اور سوز خوانوں کے پیشوا تھے۔ خواجہ صاحب نے گداز کی تمام دھنوں کو منتخب کر کے سوز خوانی کے لیے مخصوص کیا۔ خواجہ صاحب نے اس فن

کے اصول وضع کیے، قواعد وضوابط منضبط کیے، ان کے شاگرد حیدری خان نے دو قدم آگے رکھے۔ انھوں نے علم موسیقی کا گہرا مطالعہ کیا اور ہزار ہا دھنوں اور راگوں میں حزن وملال کی دھنوں کو سوزخوانی کے لیے منتخب کیا۔ اب یہ فن ممتاز ہوا اور شرفا کے لیے باعث فخر سمجھا جانے لگا۔ نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں تک نے اس فن میں شرف کمال حاصل کیا۔

ابتدا میں اس فن پر موسیقی غالب رہی جو کہ اب تک باقی ہے اور اسی وجہ سے اکثر علمائے محترم دوران سوزخوانی فرش عزا پر تشریف نہ لاتے تھے۔ اس صورت حال کو محسوس کر کے ماہرین نے سوزخوانی میں سے اس خوب صورتی کے ساتھ غنا کو الگ کیا کہ سوزخوانی کے اثرات بھی باقی رہیں اور غنا کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ رفتہ رفتہ متشرع علما بھی اس بات کے قائل ہوتے چلے گئے کہ سوزخوانی میں غنا کا پہلو بالکل نہیں ہے اور یہ غنا سے الگ ہو کر ایک عجیب پاکیزگی پیدا کرتی ہے جس کے سننے سے خدا یاد آجاتا ہے۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ سوزخوانی کے موضوع پر لکھی گئی پہلی کتاب تذکرہ ذاکرین کا تعارف علامہ رشید ترابی نے تحریر کیا۔ سبط جعفر زیدی کی کتاب صوتی علوم وفنون اسلامی کی تقریظ پروفیسر کرار حسین نے رقم کی۔ سکندر آغا کی کتاب سوزخوانی، تاریخ وتذکرہ میں مصنف کا تعارف علامہ عقیل الغروی نے کروایا اور سید آباد محمد نقوی زائر کی کتاب میراا ثاثہ کا مقدمہ علامہ طالب جوہری نے تحریر کیا۔ عہد حاضر کے نامور خطیب علامہ شہنشاہ حسین نقوی اور علامہ محمد عون نقوی کا تعلق بھی سوزخوانوں کے ایک خانوادے سے ہے اور وہ خود بھی کسی زمانے میں اس فن سے وابستہ رہے ہیں۔

سوزخوانی برصغیر کے تمام خطوں میں اپنے قدم جماتی گئی، ہر خطے کے سوزخوانوں نے سوز پڑھنے کے نئے ڈھنگ ترتیب دیے اور اپنی سخن فہمی کے بل پر اپنے اپنے بستے تیار کیے۔ ہندوستان تقسیم ہوا تو جہاں ہندوستان میں اس فن کو زوال آیا وہیں پاکستان میں اس فن کو ایک نئی زندگی مل گئی، یہ کتاب اسی سفر کی داستان ہے۔

............☆☆☆............

مجھے جب سوزخوانی سے دلچسپی پیدا ہوئی تو اس فن کے اسرار ورموز جاننے کی بھی ہمک ہوئی۔ اس موضوع کچھ پڑھنے کا تجسس ہوا مگر معلوم ہوا کہ اس موضوع پر کام نہ ہونے کے برابر ہے اور یہ کام بھی کتابوں اور رسالوں میں مضامین کی شکل میں بکھرا ہوا ہے۔ رفتہ رفتہ ان کتابوں اور مضامین تک رسائی ہوئی تو اندازہ ہوا کہ سوائے شہید سبط جعفر زیدی کسی نے بھی اس فن کے مختلف پہلوؤں کو گرفت میں نہیں لیا۔ محمد علی خان کی تذکرہ ذاکرین اور ڈاکٹر سید سکندر آغا کی سوزخوانی، تاریخ وتذکرہ سوزخوانی کے بارے

میں کم اور سوز خوانوں کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم کرتی ہیں، جو درجن بھر مضامین فراہم ہوئے ان میں بھی ایک تو لوازے کی تکرار بہت تھی دوسرے بہت سارے پہلوؤں کو چھیڑا ہی نہیں گیا تھا۔

ایسے میں میرے احباب علامہ ارتضٰی عباس نقوی اور فرحان رضا نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ میں خود ہی سوز خوانی کی تاریخ مرتب کرنے کا بار اٹھاؤں۔ چنانچہ ڈاکٹر نیر مسعود کی کتاب مرثیہ خوانی کا فن اور فرحان رضا کی کتاب تحت اللفظ خوانی کے انداز کو رہنما بنایا اور یوں یہ کتاب وجود میں آ گئی۔

کتاب کا کام شروع ہوا تو علامہ ارتضٰی عباس نقوی، ڈاکٹر تقی عابدی اور فرحان رضا نے حوالہ جاتی لوازے سے نوازنا شروع کیا۔ علامہ ضمیر اختر نقوی نے ڈاکٹر سکندر آغا کی نایاب کتاب فراہم کی۔ ارتضٰی عباس نقوی کی نشاندہی پر محمد علی خان کی کتاب انجمن ترقی اردو، پاکستان کے کتب خانہ خاص سے حاصل ہوئی۔ لکھنؤ سے جناب محبوب احمد خان نے منجھو صاحب پر ایک نادر مضمون فراہم کیا، ڈاکٹر اسد اریب نے سوز خوانی پر لکھے گئے اپنے دو عمدہ مضامین سے مدد فرمائی، ڈاکٹر فہیم شناس کاظمی، طارق بن آزاد اور کرن صدیقی نے مختلف لائبریریوں میں رسالوں کے ڈھیر سے چند اہم مضامین کے عکس بہم پہنچائے۔ ان کے علاوہ علامہ شہنشاہ حسین نقوی، آفتاب علی کاظمی کے فرزند اصغر علی کاظمی، ڈاکٹر محتشم علی کے فرزند علی اکبر نقوی، مظاہر علی کاظمی کے فرزند جعفر کاظمی، انجمن حیدری علی بستی کے صاحب بیاض علی قیصر رضوی (علی بھائی)، شہید سبط جعفر کے بازو منور عباس کاشف زیدی، فیروز علی کربلائی کے پوتے جمیل ترابی، باقر علی شاہ، ہادی عسکری، علی عدنان، جاوید رضا، ماجد رضا عابدی، ڈاکٹر ہلال نقوی، سید ابن حیدر، اظہر عزمی، میر تکلم، مودود جعفری اور محترمہ روما رضوی کے مشورے ہر قدم پر ساتھ رہے۔

یہ کتاب سوز خوانی کے فن پر لکھی جانے والی شاید پہلی کتاب ہے مگر آخری نہیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ اس موضوع پر ابھی بہت کچھ لکھے جانے کی گنجائش ہے، ہو سکتا ہے کہ آنے والے وقت میں یہ خدمت اسی ناچیز کے حصے میں لکھی ہو یا پھر کوئی اور دیوانہ اٹھے اور اس بارِ گراں کو اپنے شانے پر اٹھا لے۔

تیز رکھنا سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

عقیل عباس جعفری

۱۰ محرم ۱۴۴۲ھ

۳۰ اگست ۲۰۲۰ء

ترتیب

ذاکرِ شبیرؑ یعنی قدر دانِ اہلِ بیتؑ
سوز خوانِ آل، وقفِ آستانِ اہلِ بیتؑ
سوز میں بھرتا ہے زیر و بم سے یہ تاثیرِ غم
کیفِ غم سے آشنا ہے سوز خوانِ اہلِ بیتؑ

آباد محمد نقوی زائر

ہو ذکرِ شہ تو فضا درد ناک کر پہلے
نوائے غم کے گریباں کو چاک کر پہلے
رہے ذرا بھی نہ آلائشِ طرب باقی
سُروں کے سوز کو دریا میں پاک کر پہلے

سید مہدی نجیب رضو کلیمی

لحنِ داؤدی میں جیسے قرأتِ قرآن ہے
یونہی ذکرِ کربلا کا سوز اک عنوان ہے
سوز خوانی کی فضا مجلس میں کہتی ہے یہی
سوز خوانی مجلسِ شبیرؑ کی پہچان ہے

آباد محمد نقوی زائر

جہاں کہیں نگہِ فن شناس ملتی ہے
وہاں پہ دادِ ہنر بے قیاس ملتی ہے
جو سوز خواں کا ہو ذکرِ حسینؑ پہ تکیہ
بیاض و بستہ و بازو کو آس ملتی ہے

شاداں دہلوی

لحن کے گردش پہ الفاظ ہوں تو سوز ہے
دوش پہ لفظوں کے گر ہو لحن تو گانا ہے یہ
سوز ہی وہ ہے کہ جس سے جاگ اُٹھے سوزِ دروں
موجبِ گریہ ہو تو جنت کا پروانہ ہے یہ

آباد محمد نقوی زائر

پہلا باب

سوزخوانی: ایک تعارف

سوزخوانی کے فن کے بارے میں مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے چند بیانات پیش کیے جاتے ہیں جن سے اس فن کے تعارف میں مدد ملے گی۔

(۱)

واقعات کربلا سے قبل ممکن ہے لفظِ سوز خوانی اور معنی میں استعمال ہوتا ہو مگر واقعہ کربلا نے اس لفظ کو خصوصیت بخش دی۔ جب قید سے رہائی کے بعد اہل بیت کا لٹا ہوا قافلہ مدینہ منورہ کے قریب پہنچا تو امام زین العابدین علیہ السلام نے بشیر بن جزلم کو طلب فرما کر دریافت فرمایا کہ کیا تو شعر کہہ لیتا ہے؟ بشیر نے عرض کیا کہ جی ہاں مولا۔ تب آپ نے اسے حکم دیا کہ اہل مدینہ کو ہمارے آنے کی اطلاع دے دے۔ بشیر نے حکم امام کے مطابق انتہائی درد انگیز اشعار اور رقت آمیز لہجے میں لٹے ہوئے قافلہ کی خبر اہل مدینہ کو پہنچائی کہ تمام زن و مرد بے تاب ہو کر زار و قطار روتے پیٹتے گھروں سے نکل پڑے۔ امام واقف تھے جانتے تھے کہ یہ تاثر صرف اشعار اور درد ناک لہجے میں مضمر ہے[۱]

(۲)

واقعہ کربلا کے بیان کے لیے مرثیے نے عرب میں، روضہ خوانی نے ایران میں اور سوز خوانی نے ہندوستان میں فروغ پایا۔ ابتدا میں اس فن کو "مرثیہ خوانی" کہا جاتا تھا، لیکن اس کے بالمقابل میر ضمیر، میر انیس وغیرہ نے تحت اللفظ مرثیہ خوانی کو بھی ایک فن بنا دیا تھا جس کے اپنے اصول و ضوابط مقرر تھے۔ یہ خواندگی لحن والی خواندگی سے بہت زیادہ مقبول اور مروّج ہو گئی

---

[۱] سوز خوانی: سعید حیدر زیدی سعید، مشمولہ اردو زبان اور اردو مرثیہ، مرتب: سید اقبال کاظمی، ۲۰۱۸ء، کراچی، ص: ۱۸۵

اور اس کو بھی مرثیہ خوانی کہا جانے لگا۔ اشتباہ سے بچنے کے لیے لحن والی مرثیہ خوانی کو ''سوزخوانی'' کا نام دے دیا گیا۲؎۔

(۳)

''لکھنؤ میں موسیقی کو عروج حاصل تھا اور کوئی شب ایسی نہ گزرتی کہ جب کسی نہ کسی نواب کے دولت کدے پر فن موسیقی کے جواہر نہ بکھیرے جاتے ہوں۔ لیکن جب محرم آتا تو محافل بند کر دی جاتی تھیں۔ ارباب اختیار پر یہ لمحات گراں گزرتے تھے لہٰذا اساتذۂ موسیقی نے موجودہ سوزخوانی کی بنیاد رکھی جس سے سوزخوانوں کو بھی ایک نہایت اثر انگیز ڈھنگ ہاتھ آیا اور پیاسوں کی بھی تسکین ہوئی۔ ابتدا میں موسیقی غالب رہی جو کہ اب تک باقی ہے اور اسی وجہ سے علمائے محترم کی اکثریت دوران سوزخوانی فرش عزا پر تشریف نہ لاتے تھے۔ اس صورت حال کو محسوس کر کے ماہرین نے سوزخوانی میں سے غنا کو الگ کیا اس خوب صورتی کے ساتھ کہ سوزخوانی کے اثرات بھی باقی رہیں اور غنا کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ اب سوزخوانی نے ایک فن کی حیثیت اختیار کر لی جس کے اصول و قواعد و ضوابط مرتب ہوئے''۳؎

(۴)

گویا ہو یا سوزخوان دونوں کی اساس موسیقی ہے۔ سُر اور تال میں دونوں ساتھ ساتھ ایک ہی ڈگر پر گامزن رہتے ہیں لیکن آگے چل کر ان کے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے سوزخوان اپنے اوپر کچھ قیود عائد کر کے گویّے کے زمرے سے الگ ہو جاتا ہے۔

اسلام نے موسیقی کو اچھی نظر نہیں دیکھا ہے اس کے نزدیک یہ لہو و لعب ہے جو اسلام میں منع ہے تاہم اسلام کے اندر ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو محدود غنا کو مستحسن سمجھتا ہے۔ موسیقی کی تانیں لگانے والا اور راگ سے راگ پیدا کرنے والا گویا ہے۔ یہ غزل بھی گاتا ہے اور اس عشق مجازی میں فراق و وصال کے گیت بھی جبکہ سوزخوان مرثیہ، نعت اور منقبت کے ذریعے اپنی خدا پرستی اور مذہبی پرستی کے ترانے الاپتا ہے۴؎

۲؎ سوزخوانی، حرف و صوت، ڈاکٹر نیر مسعود۔ مشمولہ: ماہنامہ شب خون، الٰہ آباد، نومبر ۲۰۰۲ء

۳؎ سوزخوانی: سعید حیدر زیدی سعید، مشمولہ اردو زبان اور اردو مرثیہ، مرتب: سید اقبال کاظمی، ۲۰۱۸ء، کراچی، ص: ۱۸۶،۱۸۵

۴؎ مجھو صاحب سوزخوان: سلامت رضوی، مشمولہ نیا دور جون، لکھنؤ، ۱۹۹۷ء، ص: ۳۶

(۵)

برصغیر کی مروجہ عزاداری میں سوز خوانی کی حیثیت وہی ہے جو نماز میں ''تکبیرۃ الاحرام'' کی ہے[۵]۔

(۶)

یہی بات قسیم ابن قسیم نے اپنے ایک قطعے میں یوں کہی ہے:

سوز خواں ہیں آب و تاب ذکر غم
ناشر اوراق باب ذکر غم
یعنی بسم اللہ قرآن عزا
یعنی آغاز کتاب ذکر غم[۶]

(۷)

استاد اشتیاق علی خان حیدری کے بقول گائیکی میں الفاظ کا سہارا اور استعمال بطور آلہ لیا جاتا ہے جبکہ سوز خوانی میں سُر ابلاغ واظہار کا محض ذریعہ اور آلہ ہے۔ استاد معشوق علی خاں حیدری کے بقول گائیکی میں الفاظ سواری ہیں جن کے دوش پر موسیقی سفر کرتی ہے جبکہ سوز خوانی میں سُر اور راگ محض سواری اور الفاظ سوار ہیں اور سُروں کے وسیلے سے سفر کر کے اپنی منزل یعنی سامعین تک رسائی حاصل کرتا ہے[۷]۔

(۸)

میر ابوالقاسم صاحب سوز خواں کے مطابق صبح کے وقت بھیروں راگ اور بھیرویں راگنی میں سوز خوانی ہوتی ہے۔ رات کے وقت ''مالکوس'' اور دیر رات گئے ''راگ درباری'' کا استعمال ہوتا ہے۔ سوز خوانی میں وقت، موقع اور محل کی مطابقت ضروری ہے۔ وقت کی مناسبت کے ساتھ یہ راگ بہت اثر انداز ہوتے ہیں[۸]۔

---

[۵] سوز خوانی، مشمولہ: صوتی علوم وفنون اسلامی، سبط جعفر زیدی، ۱۹۸۵ء، کراچی، ص: ۶۵،۶۶

[۶] عزاداری امروہا، ہمارا مذہبی ورثہ، پروفیسر منظور حسنین آرزو، ۲۰۱۷ء، کراچی، ص: ۲۱۰

[۷] مرام عزا اور سوز خوانی: سید سبط جعفر زیدی، مشمولہ: بعد قتل شاہ (مجلہ)، انجمن فدائے اہل بیت، کراچی، ۱۹۹۰ء، ص ۸۳

[۸] سوز خوانی: روایت اور آداب، ڈاکٹر سید فضل امام، مشمولہ: اردو مرثیہ، ڈاکٹر شارب ردولوی، ۱۹۹۱ء، نئی دہلی، ص: ۳۲۳

(۹)

موسیقی کے بعض استاد مثلاً عبدالکریم خان، استاد رجب علی خان اور استاد فیاض خان وغیرہ سوزخوانی بھی کرتے تھے لیکن اس میدان میں شہرت حاصل نہ کر سکے۔ استاد بڑے غلام علی خان سے یہ قول منسوب ہے کہ سوزخوانی ہماری گائیکی سے زیادہ مشکل فن ہے۔[۹]

(۱۰)

جس طرح شاعری کے ہنر سے مرثیے نے نمو پایا، بالکل اسی طرح موسیقی کے ہنر سے سوزخوانی نے جنم لیا۔ دراصل سوزخوانی ایک خاص قسم کی موسیقی ہے۔ مرثیہ جو تحت اللفظ تھا۔ وہ لفظوں کو اپنے معانی و مطالب کے اظہار کے لیے اعضا و جوارح کی مناسب اور متین حرکات و سکنات کا تقاضا کرتا تھا اور سوزخوانی، اسی مرثیے کو پر سوز لہجے اور غمگین لے میں پڑھنے کا ایک عمل تھا۔ دیکھا جائے تو فی الحقیقت، ابتدائی عزاداری جو شمالی ہند اور دکن میں تھی جس کے نتیجے میں نوحہ خوانی کا ظہور بھی ہوا۔ اسی سوزخوانی کی ایک طرز ادا تھی۔ بقول عبدالحلیم شرر لکھنؤ نے سوزخوانی کا پایہ اس قدر بلند کر دیا کہ صاحب کمال گویوں کا بازار بھی سوزخوانوں کے آگے سرد پڑ گیا۔[۱۰]

.... ☆☆☆ ....

ان بیانات سے، جو متفرق مصنفین کی تحریروں سے اخذ کیے گئے ہیں، واضح ہوتا ہے کہ تحت اللفظ خوانی کی طرح، سوزخوانی کے بھی باقاعدہ اصول و ضوابط تھے۔ سوزخوان کے لیے فن موسیقی پر مکمل عبور کے ساتھ ساتھ اعلیٰ شعری ذوق کا حامل ہونا بھی ضروری تھا۔ آج بھی اگر کوئی سوزخواں موسیقی کی باریکیوں کے ساتھ شعر کہنے پر بھی قدرت رکھتا ہو تو یہ سونے پر سہاگہ کا درجہ رکھتا ہے۔ ماضی قریب میں مہدی ظہیر ضو کلیمی، آباد محمد نقوی زائر اور سید سبط جعفر زیدی ایسے ہی سوزخوانوں میں شامل تھے۔

---

۹ سوزخوانی: حرف وصوت، ڈاکٹر نیر مسعود، مشمولہ: شب خون، نومبر ۲۰۰۲ء، الہ آباد، ص:۱۹

۱۰ سوزخوانی تاریخ و تہذیب، ڈاکٹر اسد اریب، مشمولہ: اردو مرثیے کے نئے صنعت گر، ملتان، ص:۲۰۳

دوسرا باب

سوزخوانی کے ابتدائی خدوخال

تحت اللفظ خوانی سے قبل مرثیہ پڑھنے کے لیے سوزخوانی کا فن ہی رائج تھا تاہم اسے سوز خوانی کی بجائے مرثیہ خوانی کہا جاتا تھا۔ نیر مسعود لکھتے ہیں کہ:

''عزاداری کے مراسم میں رثائی کلام کو لحن سے پڑھنے کا رواج قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ اس خوانندگی کی دھنیں ہندوستانی لوک سنگیت سے ماخوذ تھیں۔ یہی لوک سنگیت ہماری کلاسیکی موسیقی کے بہت سے راگوں کی بھی بنیاد ہے۔ ہندوستان کی عوامی دھنوں کو موسیقی کے استادوں نے تراش خراش کر کے اور اصول وضوابط کا پابند بنا کر مختلف راگوں کی شکل دی۔ لیکن عزاداری والا کلام ان ضابطوں کا پابند نہیں تھا، البتہ اس کلام کے کہنے اور پڑھنے والوں میں بہت خوش الحان اور فن موسیقی کے ماہر بھی تھے۔ میر وسودا کے زمانے کے شاعر سید عبدالولی عزلت سورتی کو ان کی مہارت فن کی وجہ سے امیر خسرو ثانی کہا جاتا تھا۔ انھوں نے رثائی شاعری بھی کی اور مجالس عزا میں ان کی خوانندگی ایک سماں باندھ دیا کرتی تھی۔ عزلت اور دوسرے باکمالوں کی وجہ سے رثائی کلام کی خوانندگی کلاسیکی موسیقی کے قریب آ گئی اور رفتہ رفتہ لحن سے مرثیے وغیرہ پڑھنے کی روایت ایک فن کی حیثیت اختیار کرنے لگی۔ اس سلسلے میں سب سے اہم نام لکھنؤ میں نوابی دور کے میر علی کا ہے جو موسیقی کے زبردست تھے۔ انھوں نے مرثیہ خوانی کی ضابطہ بندی کی اور مختلف راگوں سے استفادہ کر کے رثائی کلام کی بڑی پر اثر دھنیں تیار کیں اور ان کے کثیر التعداد شاگردوں نے اس خوانندگی کو ایک فن کی حیثیت سے فروغ دیا[1]''

سوزخوانی کے لیے عمدہ شعر فہمی ایک اضافی خوبی ہے۔ ڈاکٹر سید فضل امام کے مطابق:

---

[1] سوزخوانی: حرف وصوت، ڈاکٹر نیر مسعود، مشمولہ: شب خون، نومبر ۲۰۰۲ء، الٰہ آباد، ص: ۱۹

''آئمۂ فن نے فنونِ لطیفہ کی بہت سی اقسام بیان کی ہیں اور آسانی کے لیے دو خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک عینی اور دوسرے سماعی۔ عینی میں مصوری، مجسمہ سازی، معماری، رقص، نجاری ورخیاطی وغیرہ کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ اور سماعی میں موسیقی اور شاعری آجاتی ہے۔ موسیقی کا تعلق اصوات سے ہے لہٰذا اس میں مادّی وسائل کی زیادہ ضرورت نہیں رہتی۔ بغیر آلات موسیقی کے بھی موسیقیت پیدا کی جاسکتی ہے اور پیدا کی جاتی ہے۔ شاعری تخیل سے عبارت ہے۔ موسیقی اصوات کے ارتباط سے عالم ظہور میں آتی ہے۔ چنانچہ شاعری اور موسیقی نے ''سوزخوانی'' کو جنم دیا۔ جو نشاطیہ نہ ہوکر المیہ اور حزنیہ کیفیات کی ترجمان رہی ہے'' [۲]

سوزخوانی شروع ہوئی تو متدین علمائے کرام اور مجتہدین عظام نے اس پر تحفظات ظاہر کیے۔ شررؔ نے ''گزشتہ لکھنؤ'' میں لکھا کہ:

''سوزخوانی کو گو کہ عوام شیعہ موجب ثواب تصور کرتے ہیں مگر علمائے شیعہ نے اس وقت تک اس کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا ہے وہ پابندیٔ شرع میں مشدد ہیں۔ اب تک مجتہدین اور ثقہ لوگوں کی مجلسوں میں صرف حدیث خوانی یا تحت اللفظ خوانی ہوتی ہے اور عوام کی جن مجالس میں علمائے شریعت شریک ہوتے ہیں ان میں بھی ان کے سامنے سوزخوانی نہیں ہوتی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سوزخوانی نے اپنی عام مقبولیت کی وجہ سے علما کے فتووں پر پوری فتح پالی ہے مشکل یہ ہے کہ اہل سنت کے علمائے حدیث اور مشائخ صوفیہ کے نزدیک تو غنا کے جواز کی بہت گنجائش ہے مگر شاید فقہ اثنا عشری میں اتنی گنجائش نہیں ورنہ اس فن میں اب تک سند جواز حاصل کرلی ہوتی'' [۳]

علی جواد زیدی نے اپنی کتاب ''دہلوی مرثیہ گو'' میں لکھا ہے کہ:

''محمد شاہی دور میں مرثیہ گوئی بھی خاصی عام معلوم ہوتی ہے۔ مرثیہ خوانی ایک باقاعدہ فن کی شکل اختیار کرچکی تھی۔ ملا علی سودائی (م ۱۱۷۵ھ) محمد شاہ کے درباریوں میں تھے۔ یہ ایرانی موسیقی کے ماہر اور ہندوستانی سنگیت میں دخیل تھے۔ پسر لطف خاں، میر عبداللہ، شیخ سلطان، میر ابو تراب، مرزا ابراہیم، میر درویش حسین اور جانی حجّام نے محمد شاہ کی دلّی میں اپنی مرثیہ خوانی کی دھوم

---

[۲] سوزخوانی روایت اور آداب: ڈاکٹر سید تفضل امام، مشمولہ: اردو مرثیہ، ڈاکٹر شارب ردولوی، ۱۹۹۱ء، نئی دہلی، ص: ۳۲۹

[۳] گزشتہ لکھنؤ، عبدالحلیم شرر، ۱۹۷۳ء، لکھنؤ، ص: ۲۱۷

مجاز کمی تھی۔ ان کے علاوہ محمد ہاشم فائق، مرثیہ خوانی میں ماہر تھے۔ شہزادہ مرزا غلام حسین انداز کو مرثیہ خوانی کی کامل مشق تھی۔ مرزا جان مرزا، تاثیر انفاس سے پتھر کو موم بنا دیا کرتے تھے۔ میر حیدری وفا وہ مرثیہ خواں ہیں جن کو موسیقی میں کمال حاصل تھا۔ چونکہ اس زمانے کے شرفا اس فن کو نہیں برتتے تھے۔ اس لیے مرثیہ خوانی میں مظاہرہ فن کرتے تھے۔ تاکہ اتنے وقت تو آئمہ ہدیٰ کی یاد اور مقبولان بارگاہ الٰہی کے ذکر میں بسر ہو"۔ [۴]

"درج بالا بیان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مرثیہ خوانی یا سوز خوانی میں موسیقی کو دخل تھا۔ براہ راست موسیقی کو پیش کرنے میں شرفا کو تامل ہوتا تھا مگر سوز خوانی کے ذریعہ حصول ثواب کا راستہ نکال لیا گیا اور یہ تصور تھا کہ جتنی گھڑی آئمہ ہدیٰ کی یاد میں بسر ہوں گے اس سے نجات کا سامان فراہم ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ "سوز خوانی" نے مقبولیت حاصل کی۔ عہد فرخ سیر سے لے کر زوال سلطنت مغلیہ تک دہلی میں مرثیہ خوانی کا رواج ملتا ہے۔ مسکین کے مرثیوں کے متعلق قدرت اللہ شوق کا بیان ہے کہ ان کے مرثیے عوام و خواص خوش الحانی سے پڑھا کرتے تھے"۔ [۵]

خدا بخش موج بے مثل و بے عدیل گانے والے تھے۔ اور اگرچہ بیشتر سرائیدگی سے ماہر تھے اور گانے پر قدرت رکھتے تھے لیکن قوالی اور مرثیہ خوانی میں مصروف اور انھیں دو امر میں اطراف و اکناف میں مشہور تھے، آواز میں درد اور سرائیدگی میں اثر ایسا تھا کہ پتھر کا دل پانی ہو جاتا تھا۔ یہ اثر فقط مہارتِ فن کا طفیل نہ تھا بلکہ گداز دل اور سینہ کے بدولت تھا۔ اور یہ سوز و گداز عارفانِ باکمال کی صحبت کیمیا خاصیت سے حاصل ہوا تھا"۔ [۶]

عبدالحلیم شرر اپنی کتاب "گزشتہ لکھنؤ" میں لکھتے ہیں کہ:

"محرم میں شہادت سبط اصغرؑ کی یاد تازہ کرنا ہندوستان میں خاص شیعوں سے شروع ہوا۔ خصوصاً اس وقت سے جب کہ مذہب اثنا عشری ایران کا قومی مذہب بنا اور وہاں کے لوگ آ آ کے ہندوستان دربار میں رسوخ حاصل کرنے لگے تاہم دہلی میں چوں کہ تاجداروں اور شاہی خاندان کا مذہب سنت والجماعت تھا اس لیے وہ خاص چیزیں جو شیعوں کے مذہبی معاشرے کے ساتھ

---

[۴] دہلوی مرثیہ گو، علی جواد زیدی، ۱۹۸۸ء، کراچی، ص: ۳۳

[۵] طبقات شعرائے ہند، ص: ۳۱۳ بحوالہ علی جواد زیدی، دہلوی مرثیہ گو، ۱۹۸۸ء، کراچی، ص ۳۴

[۶] دہلوی مرثیہ گو، علی جواد زیدی، ۱۹۸۸ء، کراچی، ص: ۳۳

مخصوص تھیں وہاں نشو ونما نہ پا سکیں۔ اس لیے ان فنون کی پرورش کا گہوارہ لکھنؤ اور اس کا مرکز شیعہ دربار پا گیا۔[1]

تاہم سلامت رضوی نے اپنے مضمون منجھو صاحب سوز خوان میں شرر کے اس دعوے سے اختلاف کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ دکن میں بہمنی سلطنت شروع ہوئی تو اس وقت احمد شاہ بہمنی کے زمانے میں ایرانیوں کا زور تھا۔ وہ اپنے معتقدات و خیالات میں کٹر تھے اور ایک جگہ بیٹھ کر واقعہ شہادت سنتے تھے گویا یہ مجالس کے انعقاد کا ابتدائی دور تھا۔

عزاداری صرف شیعہ فرقے کے ساتھ مخصوص نہ تھی امام حسین کی حقانیت کے بارے میں سارے مسلمان متفق تھے اس لیے جب ایرانی اثرات کے تحت عزاداری کا رواج ہوا تو تمام مسلمانوں نے اس میں حصہ لیا اور پھر جب اس میں ثقافتی قوت حاصل کر لی تو غیر مسلم بھی اچھی خاصی تعداد میں حصہ لینے لگے۔

دکنی ریاستوں میں عادل شاہی سب سے زیادہ طاقتور اور منظم ریاست تھی۔ یہاں مرزا نامی شاعر سب سے زیادہ نامور تھے انھوں نے ساری عمر صرف نعت، منقبت اور مرثیے کہے۔ عادل شاہی زمانے میں انھوں نے انیس جیسی شہرت حاصل کی۔ انھوں نے مرثیے میں رزم داخل کی اور حضرت حر، حضرت قاسم، حضرت علی اکبر، حضرت علی اصغر اور پسران مسلم کے حال میں الگ الگ مرثیے کہے۔

دلی میں میر عبداللہ ایک سوز خوان تھے جو موسیقی کے استادوں میں شمار ہوتے تھے۔ اس خوبی سے سوز خوانی کسی نے نہیں کی، مصرع ختم نہیں ہوتا تھا کہ مجمع میں رونے کا شور مچ جاتا تھا اور آسمان کے کان بہرے ہونے لگتے تھے۔

بہادر شاہ اول اور فرخ سیر کے عہد میں قلعہ معلی کے اندر عزاداری شروع ہوئی اور کہا جاتا ہے کہ ۱۷۳۸ء میں دہلی میں بیسیوں عاشور خانے، مرثیہ گو، مرثیہ خوان اور سوز خوان موجود تھے۔ گجرات کے علاقوں میں بھی کربل کتھا اور مقاتل کی دوسری منظوم تصنیفات سوز و گداز سے پڑھی جاتی ہیں۔

۱۷۲۴ء میں جب برہان الملک سعادت خان نے اودھ کی صوبیداری سنبھالی، اس زمانے میں جون پور شیعوں سے چھلک رہا تھا۔ یہاں بھی اس وقت زیادہ تر سوز خوانی اور روضہ خوانی کا دستور تھا۔ اس مختصر تبصرے کے بعد یہ بات صاف ہو گئی کہ سوز خوانی کی ایجاد رقص و موسیقی کی تشکیل

---

[1] گزشتہ لکھنؤ، عبدالحلیم شرر، ۱۹۷۲ء، لکھنؤ، ص: ۲۱۲

دور کرنے کے لیے شاہانِ لکھنؤ کی ایجاد و اختراع نہیں تھی۔[۸]

سید کاظم رضا واعظ نے بھی سلامت رضوی کے اس بیان کی تائید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''مرثیہ اور تحت اللفظ خوانی کا آغاز جنوبی ہند میں سترہویں صدی عیسوی اور شمالی ہند میں اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہوا۔ جنوب میں حیدر آباد (دکن) اور مدراس اور شمال میں دہلی اور لکھنؤ اس کا مرکز بنا۔ تحت اللفظ خوانی بھی بنیاد پڑی۔ ایران سے آنے والوں پھر مغل شاہی نے امرائے دولت وزیران و افسران میں زیادہ تر ایرانی تھے، خود شاہی زبان فارسی تھی اس لیے اولاً فارسی کے نوحے اور مرثیے مجالس میں پڑھے جاتے تھے۔ ملا محتشم کاشی کا مرثیہ لحن و نغمہ کے ساتھ پڑھا جاتا تھا او ہفت بند کاشی بند مقبول تھا اور اکثر کے بر زبان رہتا تھا۔ اردو میں تحت اللفظ اور سوز خوانی کی ابتدائی نشو و نما جنوبی ہند میں شیعہ حکومت کے ہاتھوں ہوئی''۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ: ''شمالی ہند سے پہلے دکن میں مرثیہ کا نغمہ کے ساتھ پڑھنے کا رواج ہوا اس وقت اردو ایجاد ہو رہی تھی اور تو گڑھی صورت میں تھی اس لیے اس وقت کی بھوج پوری بولی میں جو سوز و مرثیہ باقیات میں رہ گیا ہے آج اس کا پڑھنا اور سمجھنا آسان بات نہیں ہے۔ مثلاً بھوج پوری میں مشہور سوز کا پہلا شعر یہ ہے:

کہیں بانو میں سیس نواؤں کہاں مورا سیاں تو موکا بسار گیئو
موری ناؤں بھنور بیچ ڈار گیئو اور آپن نیا اتار گیئو

سوز خوانی بعہد شجاع الدولہ فیض آباد سے سفر کر کے لکھنؤ پہنچی۔ اس دور میں ویسے مختلف فنون کے ماہرین لکھنؤ آئے، ان کے ہمراہ رکاب سوز خوان بھی چلے آئے ان کے ساتھ سوز، سلام اور مرثیے کی دھنیں بھی آئیں، یہ لکھنؤ کی پرانی خصوصیت ہے کہ علم و فن کی کوئی بات ہو لکھنؤ پہنچ کر وہ لکھنؤ کی ہو گئی۔ اس کو خاصی ترقی اور کمال میسر ہوا سوز خوانی کا بھی یہی قصہ ہے۔ ہر چند سوز خوانی کا رواج شمال، جنوب ہر جگہ شہروں قصبات میں تھا لیکن وہ پرانے طرز و طریقے سے تھی لیکن اہلِ فن نے جب خاص دھنوں سے سوز خوانی شروع کی اور رونے رلانے کے لیے مؤثر انداز اختیار کیے تو وہ دھنیں عورتوں مردوں کے گلوں میں ایسی اتر گئی کہ بغیر فنی مہارت اور غیر خاص ریاضت کے خود بخود لوگ اچھا پڑھنے لگے اور گھر گھر سے مرثیہ، نوحہ اور سوز و سلام کی آوازیں لوگوں کے گوش

[۸] مجھو صاحب سوز خوان، سلامت رضوی، نیا دور، جون ۱۹۹۷ء، لکھنؤ، ص: ۳۶، ۳۷

گزار ہونے لگیں۹

جس طرح مذہبی سرگرمی میں شاعری میں مرثیہ گوئی اور تحت اللفظ خوانی کو پیدا کیا۔ اسی طرح موسیقی میں سوزخوانی پیدا کردی پھر ان دونوں فنون کو یہاں تک ترقی دی کہ مستقل فن بن گئے اور ایسے فن جو ابتدا سے انتہا تک لکھنؤ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، تحت اللفظ خوانی مرثیوں کا متانت اور بے تکلفی کے ساتھ اس طرح پڑھنا اور بتا بتا کے سنایا ہے۔ جس طرح شاعر مشاعرے میں اپنی غزل سناتا ہے اور سوزخوان ان کو پرسوز وگداز نغمے کے ساتھ سناتا ہے۔

اصلی اور پرانی مرثیہ خوانی اور سوزخوانی ہی تھی یعنی مرثیے مجلسوں میں ہمیشہ نغمے (لحن) کے ساتھ سنائے جاتے تھے اور ان کا رواج دہلی میں نہیں ہندوستان کے ان تمام شہروں میں تھا جن میں شیعہ حضرات آباد تھے۔

سوزخوانی اگرچہ پہلے سے تھی اور ہر جگہ تھی مگر اس میں بھی لکھنؤ کے سوزخوانوں نے ایسے ایسے کمال دکھائے کہ اس فن کو بھی اپنے ساتھ مخصوص کردیا۔ سارے ہندوستان کی اگلی سوزخوانی کا پایہ اس قدر بلند کردیا کہ صاحب کمال گویوں کا بازار بھی سوزخوانوں کے آگے سرد پڑ گیا۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، لکھنؤ میں سوزخوان دیگر اہل فن کی طرح نواب شجاع الدولہ کے ساتھ یا ان کے عہد میں آئے۔ تاریخ فیض آباد میں لکھا ہے کہ شجاع الدولہ کی بیوی بہو بیگم صاحبہ کے محل میں مجلسیں ہوتیں اور جواہر علی خاں خواجہ سرا جوان کی ڈیوڑھی اور سارے علاقے کا مختار تھا، مرثیہ خوانوں کی نوحہ خوانی سنا کرتا مگر اس وقت تک یہاں کی سوزخوانی وہی تھی جو ہر جگہ عام تھی۱۰۔

قدیم لکھنؤ میں شرر نے "سوزخوانی" کو صرف شیعوں سے منسوب کیا ہے اور صرف انھیں شہروں میں سوزخوانی کا رواج قرار دیا ہے۔ جہاں شیعان علی ابن ابوطالب کی آبادیاں تھی۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ عزاداری حسینؑ میں ہندو مسلمان اور سنّی شیعہ بھی شریک رہے ہیں لہٰذا سوزخوانی کی روز افزوں ترقی بھی کسی ایک فرقہ کی رہین منت نہیں۔ جیسا کہ خود شرر بھی اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اس کا موجد ایک سُنی المذہب ہے۔ ملاحظہ ہو:

---

۹ سوزخوانی کے مرثیے، سید کاظم رضا واعظ، مشمولہ: کتاب کربلا (ادبیات کربلا نمبر)، نظیم المکاتب، ۱۹۹۳ء، لکھنؤ، ص: ۲۹

۱۰ گزشتہ لکھنؤ: عبدالحلیم شرر، ۱۹۷۴ء، لکھنؤ، ص: ۲۱۲ تا ۲۱۳

''بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ فن خواجہ حسن مودودی سے شروع ہوا۔ وہ ''اصول النغمات الآصفیہ'' کے مصنف محمد رضا خان کے استاد اور باوجود اتائی ہونے کے فن موسیقی میں ایسا کمال رکھتے تھے کہ دور دور تک کہیں ان کا جواب نہ تھا۔ اگرچہ سنی المذہب تھے مگر انھوں نے موسیقی کی خاص خاص دھنیں سوزوں میں قائم کر کے اپنے شاگردوں کو بتائیں اور اس فن کے باضابطہ و باقاعدہ بننے کی بنیاد پڑ گئی'' [۱]

شرر کا یہ بیان ان کے اپنے بیان کی تردید کرتا ہے۔ دراصل سوز خوانی ایک فن ہے جو کسی ایک فرقہ کی چیز نہیں۔ اسے فن کے طور پر برتا گیا اور عزائے حسینؑ میں شریک ہو کر حصول ثواب کا ذریعہ نیز خراج عقیدت کا پاکیزہ انداز بھی قرار پا گئی۔

............☆☆☆............

آصف الدولہ کے زمانے میں موسیقی پر بیشتر کتابیں لکھی گئیں۔ جن کے صرف نام ہی ہم تک پہنچے ہیں۔ لیکن جو سب سے اہم کتاب آصف الدولہ کے عہد میں لکھی گئی اور ان ہی کے نام سے منسوب کی گئی، وہ آج بھی مل جاتی ہے یعنی ''اصول النغمات الآصفیہ'' کتب خانہ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں اس کتاب کا ایک مخطوطہ موجود ہے جو چھوٹی تقطیع پر بہت ہی دبیز تحریر میں نقل ہوا ہے۔

''اصول النغمات الآصفیہ'' وہ معرکہ آرا کتاب ہے جس پر آج کا تمام فن موسیقی انحصار کرتا ہے۔ جس پر موجودہ موسیقی کے نظریات اور گائیکی کا دارومدار ہے۔ یہ کتاب جتنی مشہور اور معروف ہے اس کے مصنف کے بارے میں معلومات اتنی ہی کم دستیاب ہوتی ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے مصنف محمد رضا خاں تھے اور اس کا سن تصنیف ۱۸۱۳ء ہے [۲]

---

[۱] گزشتہ لکھنؤ: عبدالحلیم شرر، ۱۹۷۴ء، لکھنؤ، ص: ۲۱۳

[۲] ''شاہان اودھ اور موسیقی'': ڈاکٹر حبیب نثار، مشمولہ: نیا دور (اودھ نمبر)، فروری، مارچ ۱۹۹۳ء، لکھنؤ، ص: ۱۵۳

تیسرا باب

سوزخوانی کے چند ابتدائی اساتذہ

(تقسیم ہندوستان تک)

گزشتہ باب میں عبدالحلیم شرر کے ایک بیان کا حوالہ دیا گیا ہے کہ سوزخوانی کا آغاز خواجہ حسن مودودی سے ہوا۔

ڈاکٹر حبیب نثار نے اپنے مضمون "شاہان اودھ اور موسیقی" میں لکھا ہے کہ خواجہ حسن مودودی نواب آصف الدولہ کے عہد میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ انھوں نے کافی طویل عمر پائی چنانچہ عہد نواب سعادت علی خان میں انھیں دربار کی سرپرستی حاصل ہوئی[1]

گزشتہ لکھنؤ کے مصنف عبدالحلیم شرر نے خواجہ حسن مودودی کے بارے میں یہ بھی بتایا ہے کہ:

"موسیقی میں ان کے کمال کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مرہٹوں کی دست برد کے زمانے میں وہ میانے میں سوار لکھنؤ سے اٹاوہ کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں کسی گاؤں میں گزر ہوا اور سنا گیا کہ اس گاؤں پر مرہٹے تاخت کرنے والے ہیں، کہاروں نے جو بہت دور سے انھیں لیے چلے آتے تھے یکایک میانہ رکھ دیا اور کہا ہم میں اب آگے چلنے کی طاقت نہیں ہے ہزار کہا گیا کہ یہ مقام خطرناک ہے مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ خواجہ صاحب نے زندگی سے مایوس ہو کر وضو کیا اور عصر کی نماز پڑھی اور بیٹھے بیٹھے پکھالا پنا شروع کیا اور اس کا کہاروں پر اس قدر اثر پڑا کہ تازہ دم ہو گئے اور امن کی جگہ پہنچا دیا"[2]

---

[1] "شاہان اودھ اور موسیقی": ڈاکٹر حبیب نثار، مشمولہ: نیا دور (اودھ نمبر) فروری، مارچ ۱۹۹۳ء، لکھنؤ، ص: ۱۵۳

[2] گزشتہ لکھنؤ، عبدالحلیم شرر، لکھنؤ، ۱۹۷۴ء، حاشیہ ص: ۲۱۳

اس کے بعد جب حیدری خان کا زمانہ آیا تو ان کا معمول تھا کہ محرم میں اپنے مذاق کی مناسب دھنوں میں نوحہ خوانی کیا کرتے چوں کہ وہ بہت بڑے صاحب کمال گویے تھے اور دربار قدر دان تھا اس کوشش میں ان کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور پتا لگ گیا کہ اگر ترقی دی جائے تو یہ فن جداگانہ طور پر ایک خاص اور ممتاز شان پیدا کر سکتا ہے، موسیقی کی ہزار ہا دھنوں میں سے وہ دھنیں منتخب کی گئیں جو اظہار حزن و ملال اور بین کے لیے موزوں و مناسب ہوں اور وہ صدہا سوزوں میں قائم کی گئیں۔[۳]

حیدری خان کے مزاج کی وارفتگی اور فن پر گرفت کا ذکر سید اسرار حسین خان نے اپنی کتاب ''قدیم ہنر و ہنر مندان اودھ'' میں کیا ہے:

''حیدری خان غازی الدین حیدر کے عہد میں فن موسیقی کے کامل و اکمل تھے۔ اپنی وارفتہ مزاجی کی وجہ سے سڑی حیدری خان مشہور تھے۔ یہ محلہ گولہ گنج میں رہا کرتے تھے۔ بادشاہ کو ان کا گانا سننے کا بے حد شوق تھا مگر کبھی اس کا کوئی موقع نہیں ملتا تھا۔ اتفاقاً ایک دن غازی الدین حیدر ہوادار پر سوار دریا کنارے سیر کو نکلے، رومی دروازے کے نیچے لوگوں نے دیکھا کہ حیدری خان چلے جاتے ہیں، بادشاہ سے مصاحبین نے عرض کی کہ قبلہ عالم حیدری خان یہی ہیں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ بلالاؤ۔ لوگ خان صاحب کو پکڑ لائے۔ بادشاہ نے کہا کہ ارے میاں حیدری خان کبھی ہمیں اپنا گانا نہیں سناتے، بولے کہ جی ہاں کیوں نہ سناؤں گا مگر مجھے آپ کا مکان معلوم نہیں ہے، بادشاہ بے اختیار ہنس پڑے، بادشاہ ساتھ لے گئے محل میں بیٹھ کے گانا سننے لگے، بہت محظوظ ہوئے وجد کا عالم طاری ہو گیا۔ بے خود و بے تاب ہو گئے، یہ حالت دیکھ کے حیدری خان خاموش ہو گئے، بادشاہ نے پھر گانے کو کہا تو بولے کہ یہ تمبا کو جو آپ کے پیچوان میں بھرا ہوا ہے بہت عمدہ ہے آپ کس کی دکان سے منگواتے ہیں، بادشاہ کو یہ برا معلوم ہوا مگر لوگوں نے کہا کہ قبلہ عالم سڑی تو سڑی ابھی تک یہی نہیں سمجھا کہ کس سے باتیں کر رہا ہوں، تھوڑی دیر کے بعد پھر حیدری خان نے گانا شروع کیا، بادشاہ نے کہا کہ اگر مجھے خالی خوش کیا، رلایا نہیں تو یاد رکھو گومتی میں ڈبو دوں گا، اب تو حیدری خان کی عقل چکرائی سمجھے کہ یہ بادشاہ ہیں، کہا کہ حضور اللہ مالک ہے اور جی توڑ کر گانے لگے۔ خدا کی قدرت کہ تھوڑی سی دیر میں بادشاہ پر گانے کا یہ اثر ہوا کہ رونے لگے اور

[۳] گزشتہ لکھنؤ، عبدالحلیم شرر لکھنؤ، ۱۹۷۰ء، ص: ۲۱۳

خوش ہو کے کہا کہ کیا مانگتے ہو عرض کیا کہ یہ مانگتا ہوں کہ مجھے پھر کبھی نہ بلوایئے گا اور نہ گانا سنیئے گا، بادشاہ نے تعجب سے پوچھا کہ کیوں؟ عرض کیا آپ کا کیا ہے مجھے مروا ڈالیے گا پھر مجھ سا حیدری خان پیدا نہ ہوگا اور آپ مرجائیں گے تو فوراً دوسرا بادشاہ ہو جائے گا۔ اس جواب پر بادشاہ نے منہ پھیر لیا یہ موقع پا کر بھاگ گئے''۔[۴]

انھی حیدری خان نے اپنے فن موسیقی و سوز خوانی کو میر علی صاحب کو بخشا جنھوں نے اسے شہرت عام اور بقائے دوام عطا کیا[۵]۔ سید میر علی صاحب ایک شریف النسل سید زادے تھے اور انھوں نے مذہبی جوش میں اس فن کو بہت زیادہ ترقی دی اور اپنے زمانے میں اتنے بڑے صاحب کمال مشہور ہوئے کہ نواب سعادت علی خاں کے عہد میں انھوں نے کسی بات پر برہم ہو کے لکھنؤ سے چلے جانے کا ارادہ کیا تو انشا اللہ خاں نے اپنے مؤثر شاعرانہ انداز اور تمسخر کی شان سے سفارش کی اور نواب نے دل دہی اور قدر دانی کے ساتھ انھیں روکا[۶]۔

رجب علی بیگ سرور نے لکھا ہے کہ:

''جناب میر علی صاحب نے وہ طرز نو مرثیہ خوانی کا ایجاد کیا کہ چرخ کہن نے مسلم الثبوت استاد کہا۔ علم موسیقی میں یہ کمال بہم پہنچایا، اس طرح کا دھرپد، خیال، ٹپہ گایا اور بتایا کہ کبھی کسی نائیک کے وہم و خیال میں نہ آیا تھا۔ ایک رنگین احاطہ کھینچا ہے جو اس میں آیا پھولا پھلا، وہ اس کا پیرو ہوا اور جس نے ڈھنگ جدا کیا وہ ٹکسال باہر بدرنگ ہوا۔ اگر تان سین جیتا ہوتا تو ان کے نام پر کان پکڑتا۔ بھیک مانگ کھاتا مگر نہ گاتا۔ ہزاروں شاگرد جگت استاد ہوا، مولوی سب میں پریزاد ہوا''۔[۷]

ڈاکٹر حبیب نثار نے شاد عظیم آبادی کے ایک بیان کا حوالہ دیا ہے اور شاد کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے کہ:

''ایک مرتبہ میر علی نے جب ضمیر کا مرثیہ ''سپیدہ صبح کا جب رن میں آشکار ہوا''۔ بھیرویں میں پڑھا تو سینکڑوں کو غش آگیا اور برسوں تک لوگ اس کا مزا لیتے رہے''۔

---

[۴] سید اسرار حسین خان، قدیم ہنر و ہنرمندان اودھ، ۱۹۳۶ء، لکھنؤ، ص: ۵۹، ۶۰)

[۵] سوز خوانی: تاریخ و تذکرہ، ڈاکٹر سید سکندر آغا، ۱۹۹۹ء، لکھنؤ، ص: ۲۰)

[۶] گزشتہ لکھنؤ، عبدالحلیم شرر، ۱۹۷۴ء، لکھنؤ، ص ۲۱۳، ۲۱۴)

[۷] رجب علی بیگ سرور، فسانۂ عجائب، ۱۸۶۷ء، لکھنؤ، ص: ۹)

شاد عظیم آبادی نے جو کچھ لکھا ہے وہ صد فیصد صحیح ہو سکتا ہے اور اس مرثیے کے جادو نے سننے والوں کے سر پر چڑھ کر اس لیے اثر کیا ہوگا کہ میر ضمیر نے اس مرثیے کے چہرہ میں صبح کا منظر بیان کیا ہے اور بھیرویں صبح گائی جانے والی راگنی ہے۔ راگنی کے تیور سُر اور صبح کے منظر نے یقیناً ''سماں اور سماع'' باندھ دیا ہوگا''۔[۸]

سید افضل حسین ثابت رضوی لکھنوی نے مرزا سلامت علی دبیر کی سوانح ''حیات دبیر'' میں لکھا ہے کہ:

''مرزا صاحب نے جب ابتداً قریباً ۱۲۳۰ھ میں مرثیہ کہنا اور پڑھنا شروع کیا ہے۔ تو اس زمانہ میں اکثر مرثیہ گو شاعر گویا سوز خوانوں کے دست نگر تھے اور ایک بڑے کامل سوز خواں میر علی صاحب موجود تھے۔ جن کے در دولت پر بڑے بڑے شاہزادے اور حکام سننے کو آتے تھے۔ اور وہ کسی کے یہاں نہ جاتے تھے''۔[۹]

مولانا سید آغا مہدی کی ایک تحریر کے مطابق میر علی کے مداحوں میں شیعہ غیر شیعہ کی تفریق نہ تھی۔ رقعات مرزا قتیل میں مرزا قتیل نے اپنی بیماری کے باوجود میر علی کو سننے کے لیے جانے کا ذکر کیا۔ آغا مہدی نے اسی تحریر میں لکھنؤ کے صوفی بزرگ شاہ عبدالرحمٰن کا اشتیاق سوز خوانی ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ''حضرت مولانا ایک روز خود بخود فرمانے لگے ہماری طبیعت چاہتی ہے کہ مرثیہ میر علی کا، کہ مرثیہ خوانی میں وہ شہرۂ آفاق ہیں، سنیں، مگر مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاؤں میں طاقت نہیں ہے کہ ان کے مکان پر جا کر سنیں، وہ سوائے اپنے مکان کے دوسری جگہ جا کر مرثیہ نہیں پڑھتے۔ خادموں نے عرض کیا کہ بسواری فینس ان کے مکان پر تشریف لے جائیں اور مرثیہ ان کا سنیں، آپ نے فرمایا کہ مرثیہ سننے جائیں اور سوار ہو کر جائیں، یہ بے ادبی ہم سے نہ ہوگی''۔

سید آغا مہدی نے مزید لکھا ہے کہ:

''لکھنؤ سے سوز خوانی کو جو فروغ ہوا وہ میر علی کا فیض تھا اور انھیں کے شاگرد تھے جو شیعہ ریاستوں راجہ مہاراجہ کے عزاخانوں میں رونق عزا بڑھاتے رہے۔ لکھنؤ اور یوپی سے سوز خوانی

۸؎ شاد عظیم آبادی، فکر بلیغ، بحوالہ ڈاکٹر حبیب نثار، ''شاہان اودھ اور موسیقی'' مشمولہ: نیا دور (اودھ نمبر)، فروری، مارچ ۱۹۹۳ء، لکھنؤ، ص: ۱۵۵

۹؎ ثابت لکھنوی، حیات دبیر، ۱۹۱۳ء، لاہور، ص: ۷۹تا۸۰

اٹھتی جا رہی ہے پھر بھی جس حد تک فن باقی ہے وہ اسی ساغر الفت کا تلچھٹ ہے جس کے میر علی جرعہ نوش تھے"۔[۱۰]

نواب یمین الدولہ نے سید میر علی کے شہرۂ کمال سے مشتاق ہو کر ان کو طلب کیا، انھوں نے جانے سے انکار کیا اور لکھنؤ سے چلے جانے کا قصد کیا مگر نواب کی قدر دانی کی وجہ سے ان کو رکنا پڑا اور میر صاحب کا دو سو روپیہ مشاہرہ نواب صاحب نے مقرر فرمایا[۱۱]

گویا کتاب ناجو اور بنی کے مصنف (واجد علی شاہ اختر) کا دور آتے آتے مرثیہ خوانی نے موسیقی کو تقدس اور پاکیزگی عطا کر دی تھی اور اس کا اصطلاحی نام سوز پڑ گیا تھا[۱۲]

سنا ہے کہ میر علی صاحب کی شہرت سن کر میر احمد صاحب لکھنؤ میں ان کے مقابلہ کے لیے تشریف لائے۔ یہ بھی علم موسیقی میں یکتائے فن سنے جاتے ہیں۔ میر احمد صاحب کے لکھنؤ میں آتے ہی میر علی صاحب نے بستر اٹھایا۔ سچ ہے۔

عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر
کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے[۱۳]

سید اسرار حسین خان نے میر احمد کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ نہایت خوش گلو تھے اور واجد علی شاہ کے دربار سے ان کے عہد ولی عہدی سے منسلک تھے۔ ان کے ساتھ انھی کی طرح کے ایک اور سوز خوان بھی واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ تھے جن کا نام گوہر علی تھا[۱۴]

ادیب سہیل نے منشی کرم امام خان کی کتاب معدن الموسیقی کے حوالے سے میر احمد کا تعلق عظیم آباد سے بتایا ہے اور لکھا ہے کہ:

"وہ دھرپدیے تھے اور انھوں نے لکھنؤ میں سوز خوانی کی روایت کی نشاۃ الثانیہ مرتب کی"۔

ادیب سہیل مزید لکھتے ہیں کہ:

"میر احمد عظیم آبادی کو دھرپد کی تعلیم سنی گھرانے کے ایک بزرگ چھجو خان سے حاصل

---

[۱۰] میر علی سوز خوان، سید آغا مہدی، مشمولہ: ہفت روزہ ارشاد، ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۱ تا ۲ نومبر ۱۹۶۱، کراچی، ص: ۱۳

[۱۱] قدیم ہنر و ہنر مندان اودھ، سید اسرار حسین خان، ۱۹۳۶، لکھنؤ، ص: ۸۳، ۸۵

[۱۲] "شاہان اودھ اور موسیقی"، ڈاکٹر حبیب نثار، مشمولہ: نیا دور (اودھ نمبر) فروری، مارچ ۱۹۹۳، لکھنؤ، ص: ۱۵۵

[۱۳] حیات دبیر، ثابت لکھنوی، ۱۹۱۳، لاہور، ص: ۸۲

[۱۴] قدیم ہنر و ہنر مندان اودھ، سید اسرار حسین خان، ۱۹۳۶، لکھنؤ، ص: ۸۶

ہوئی۔ انھی چھجو خان کے شاگرد معدن الموسیقی کے مصنف کے والد محترم دلاور علی خان بھی تھے۔ میر احمد دھرپدیے سوز خوانی میں منشی رحم علی عظیم آبادی کے شاگرد تھے جو اپنے زمانے کے بہت بڑے دلدادگان موسیقی و سوز خوانی میں شمار ہوتے تھے۔ میر احمد عظیم آبادی کے دور تک لکھنؤ میں مرثیہ و سوز خوانی کے لیے دھرپد استعمال کیا جاتا تھا۔ ایسا اس لیے تھا کہ ان بزرگوں کے ملحوظ سوز خوانی کے مضامین کا تقدس تھا''۱۵

اس کے بعد تان سین کے خاندان کے ایک گویے ناصر خاں نے لکھنؤ میں اپنے فن کی دھوم مچائی۔ وہ میر ناصر علی خان خیالیے کے نام سے معروف تھے۔ انھوں نے اور بعض دوسرے استادان فن نے سلطانی دربار کی داد و دہش کے پیش نظر سوز کے مضامین خیال، راگ اور ٹھمری میں بھی رواج دینے کی سعی کی۔ دھرپد کے مقابلے میں یہ دونوں طرح کی گائیکی کے اسلوب آرائشی تھے۔ مینڈھ مرکی، زمزمے اور تانیں موقع بے موقع لگائی جانے لگیں، طرز سوز خوانی اتنی مقبول ہوئی کہ بڑے بڑے نام سامنے آئے۱۶

میر ناصر علی خان نے اپنے پڑوس کی ایک مفلس و بیوہ سیدانی پر ترس کھا کے ان کے دو بچوں میر علی حسن اور میر بندہ حسن کو سوز خوانی کی تعلیم دی، ان دونوں کا کمال تمام ماسبق استادوں سے بڑھ گیا اور سوز خوانی میں بے عدیل و نظیر ثابت ہوئے۔ انھوں نے سوز خوانی کو اعلیٰ درجہ کا راگ بنادیا ہے یہاں تک کہ موسیقی کے اصلی راگوں کے بول تو اکثر گویوں تک کو یاد نہیں مگر ایسے سوز اکثر سوز خوانوں کو یاد ہیں جو راگوں کے بول ہیں جن کو سن کے حقیقی راگ اور ان کی دھنیں متمائز طور پر سمجھ لی جاسکتی ہیں۔

انھیں بزرگوں کی وجہ سے لکھنؤ میں سوز خوانی کا فن گویوں سے نکل کے شرفا میں آگیا اور کثرت سے ایسے لوگ پیدا ہونے لگے جو ڈوم ڈھاڑی نہیں شریف وضع دار ہیں مگر سوز خوانی میں ایسا کمال رکھتے ہیں کہ گویوں کا بازار ان کے سامنے سرد پڑ گیا ہے۱۷

---

۱۵ معدن الموسیقی، منشی کرم امام خان، بحوالہ: ''مرثیہ و سوز خوانی میں موسیقی و غنا کا فرق و استعمال، عہد انیس سے عہد حاضر تک''، ادیب سہیل، مشمولہ: رثائی ادب، کراچی (انیس نمبر)، شمارہ: ۲۷، ۲۸، ۲۰۰۲ء، ص: ۵۱۲، ۵۱۳ (تلخیص)

۱۶ ''مرثیہ و سوز خوانی میں موسیقی و غنا کا فرق و استعمال، عہد انیس سے عہد حاضر تک''، ادیب سہیل، مشمولہ: رثائی ادب، کراچی (انیس نمبر)، شمارہ: ۲۷، ۲۸، ۲۰۰۲ء، ص: ۵۱۳ (تلخیص)

۱۷ قدیم لکھنؤ: عبدالحلیم شرر، ۱۹۷۶ء، لکھنؤ، ص ۲۱۴

میر علی حسن اور میر بندہ حسن کے قدر دانوں میں رئیس مرشدآباد بھی شامل تھے اور خصوصاً میر بندہ حسین کو وہ ایک دم جدا نہ کرتے تھے۔ میر علی حسن اور میر بندہ حسن کے بلاواسطہ یا بالواسطہ شاگردوں اور فیض یافتگان میں میر مہدی حسین، میر فدا علی، حمزہ علی، عابد علی خان، محمد مرزا خان، سید سجاد حسین اور نواب اچھے صاحب کے نام سرفہرست تھے جو اپنے زمانے کے نامی گرامی سوز خوان تھے۔ ان کے بعد لکھنؤ میں جن سوزخوانوں نے اپنا نام کا کلمہ پڑھوایا ان میں احمد علی خان، میر زکی، نواب نادر مرزا اور سلطان علی خان کے نام سرفہرست تھے۔ میر زکی کے بھانجے اور شاگرد رشید میر محمود اور محمود کے فرزند اور یادگار میر علی محمد صاحب تھے۔[۱۸]

میر علی محمد نے آخری دور میں میر انیس کی طرح مجلسیں پڑھنا ترک کر دی تھیں۔ مرشدآباد سے ان کا ساٹھ روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر تھا۔ اسی وظیفے پر وہ اپنی ایک بیٹی کے ساتھ فارغ البالی سے بسر کرتے تھے۔ میر علی محمد کے شاگرد منجھو صاحب تھے۔ انھوں نے بیسویں صدی کے اوائل میں لکھنؤ میں سوزخوانی کے فن میں کمال حاصل کیا اور سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ منجھو صاحب کا ذکر عبدالحلیم شرر، سید افضل حسین ثابت رضوی لکھنوی اور مرزا جعفر حسین نے بھی کیا ہے۔ ان کے کمال فن کا ذکر سعید حیدر زیدی کے مضمون ''سوزخوانی'' میں بھی ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''جن حضرات کو سننے کا شرف مجھے حاصل ہوا ان میں سب سے قدآور شخصیت جناب سید منظور حسین عرف منجھو صاحب کی ہے کہ ان جیسا ماہر سوزخوان نہ ان سے پہلے ہوا نہ ان کے بعد آج تک دیکھنے میں آیا۔ یہ حضرت لکھنؤ سے تعلق رکھتے تھے اور میرے دادا سید امیر حسن مرحوم کے ٹوپ بدل بھائی تھے۔ فن سوزخوانی پر کس قدر دسترس حاصل تھی اور کتنا عبور رکھتے بس یہ انھی کا حصہ تھا۔ سوزخوانی کے پورے لوازمات کی پابندی کرتے تھے اور کبھی حدود سے تجاوز نہ کرتے تھے اور کہیں بھی تشنہ نہ چھوڑتے تھے مضمون کے مطابق سوز کی طرز ہوتی تھی جس کے ذریعہ نفس مضمون کو دلوں میں اتارتے تھے۔ سامعین میں سے کوئی بھی اپنا ہو یا غیر پوری طرح متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔ میری والدہ مرحومہ علی گڑھ کی رہنے والی تھیں۔ یہاں کی عشرہ ثانی کی ایک مجلس میں استاد منجھو صاحب ہر سال سوزخوانی کرتے تھے۔ میرے نانا سید مزمل حسین مرحوم کے اکثر دوست احباب روسائے علی گڑھ اہل سنت تھے جو استاد منجھو صاحب کو سننے مجلس میں لازمی آتے تھے اور پوری توجہ و

۱۸۔ حیات دبیر، سید افضل حسین ثابت رضوی لکھنوی۔ مولوی غلام عباس تاجر کتب، لاہور۔ ۱۹۱۳ء۔ ص: ۸۳،۸۴

انہماک کے ساتھ سماعت فرماتے اور داد سے نوازتے تھے اور گریہ بھی کرتے تھے۔ایک مجلس میں، میں نے دیکھ کر استاد منجھو صاحب نے رباعی شروع کی، ان کے شاگرد جناب زندے رضا ان کے بازو پڑھوا رہے تھے۔ پہلے مصرع پر سامعین نے داد دی۔ دوسرے مصرع پر سامعین نے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر داد دی تیسرے مصرع پر سامعین نے بے ساختہ گھٹنوں کے بل کھڑے ہوکر داد دی اور چوتھے مصرع پر سامعین سر پیٹ رہے تھے اور دھاڑیں مار کر بے تابانہ گریہ کر رہے تھے۔ یہ تھا کمال فن اور سوزخوانی سے عقیدت کا معیار"۱۹

منجھو صاحب کے تفصیلی حالات زندگی سلامت رضوی نے اپنے مضمون "منجھو صاحب سوز خوان" میں رقم کیے ہیں۔

سلامت رضوی کے مطابق منجھو صاحب میر پناہ علی کے اکلوتے بیٹے تھے اور امام باڑا الماس سرائے معالی خان لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔منجھو صاحب کی والدہ میر علی محمد صاحب کی قریبی رشتہ کی بہن تھیں۔ میر صاحب کبھی کبھی اپنی بہن سے ملنے امام باڑہ الماس علی خاں واقع سرائے معالی خاں آیا جایا کرتے تھے۔ایک مرتبہ جب بہن کے گھر پران کی فینس آ کر رکی تو انھوں نے کسی کو بہت اچھی آواز میں غزل کا یہ مطلع ترنم سے پڑھتے ہوئے سنا۔

ہر روز حسینوں کا دیدار نہیں ہوتا
یہ طور کا جلوہ ہے ہر بار نہیں ہوتا

اور جب فینس سے اتر کر انھوں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ منجھو صاحب ہیں یعنی ان کے بھانجے۔ میر علی محمد کی کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی اور انھیں اس کی تمنا تھی کہ کوئی ایسا ہوتا جو ان کے فن میں ان کا جانشین بن سکتا۔ بھانجے کی سریلی آواز سن کر گویا ان کی دلی مراد بر آئی، بہن سے ملے اور فرمائش کی کہ اپنے لڑکے کو میرے حوالے کر دو۔ میں اس کو اپنا فن بھی سکھاؤں گا اور اپنا جانشین بھی بناؤں گا۔لوگ میر علی محمد صاحب کی شاگردی کی تمنا کیا کرتے تھے۔ یہاں یہ عالم کہ خود استاد شاگرد بنانے کی تمنا کر رہا ہے۔ ماں باپ نے یہ درخواست منظور کر لی اور پھر ایک دن منجھو صاحب کو ان کے ماموں جان کے گھر واقع محلہ مہدی گنج پہنچا دیا گیا۔

۱۹۔سوز خوانی:سعید حیدر زیدی سعید ، مشمولہ: "اردو زبان اور اردو مرثیہ" سید اقبال حسین کاظمی،۲۰۱۸ء، کراچی،ص:۱۸۶

میر علی محمد صاحب سُر بیورہ کے سلسلے میں بہت سخت تھے، ان کا خیال تھا کہ جو لوگ ابتدا میں کسی کامل استاد سے موسیقی کا علم حاصل نہیں کرتے اور سُر وغیرہ ٹھیک نہیں کر لیتے ان کو بدآواز اور بے اصول گانے کی مشق ہو جاتی ہے اور پھر بقول شخصے "تا ثریا می رود دیوار کج" اس لیے اگر ابتدا خراب ہوگئی تو استادوں کامل کی کوششیں بھی اثر انداز نہ ہو سکیں گی۔

پھر ان کو محلہ شاہ گنج کے ایک بہت بڑے استاد موسیقی کے پاس بھیج دیا گیا جہاں انھوں نے کامل چار سال ریاض کیا۔ وہ خود فرماتے تھے کہ دو گھنٹے کے ریاض کے بعد انھیں پسینہ آجاتا تھا۔ جب اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ لڑکے کی تعلیم میری مرضی کے مطابق ہوگئی تو میر علی محمد صاحب نے اب انھیں اپنے پاس بلایا اور سب سے پہلے ان سے یہ عہد اور میثاق لیا کہ وہ اپنی زبان کھولیں گے تو صرف مدح رسولؐ اور آل رسول نیز ذکر سید الشہدا میں کبھی کوئی ایسا کلام نہیں گائیں گے جو خلاف تعلیمات اسلام ہو۔ پھر انھوں نے سوز، سلام اور مرثیے پڑھنے کے ڈھنگ، آداب مجلس اور سوز خوانی کے قاعدوں سے آگاہ کیا۔ ایک سال کی محنت کے بعد انھیں اس قابل بنا دیا کہ وہ لکھنؤ کے مشہور و معروف سوز خوانوں کا مقابلہ کر سکیں۔

اس زمانے میں مفتی گنج میں مرزا محسن صاحب محدث کے گھر پر سال میں ایک مرتبہ سوز خوانی کی ایک بہت بڑی مجلس ہوا کرتی تھی۔ مجلس کیا ہوتی تھی۔ سوز خوانوں کا مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ اس مجلس میں اچھے صاحب، قادر صاحب، میر زندے رضا صاحب اور بہت سے نامی گرامی سوز خوان شرکت کرتے تھے۔ موسیقی کے ماہرین کی ایک کمیٹی یہ فیصلہ کرتی تھی کہ اس سال کا سب سے بہتر سوز خوان کون ہے۔ منجھو صاحب بھی اس مجلس میں جاتے تھے لیکن صرف سامع کی حیثیت سے۔ استاد کی طرف سے مقابلہ میں اترنے کی اجازت نہیں تھی۔ کئی سال تک جاتے اور مجلس میں اپنے جوہر دکھانے کے لیے بے چین رہتے۔ غرض دو تین سال کے بعد استاد نے اجازت دے دی کہ اس مرتبہ تم بھی شرکت کرنا اور جب وہ دن آیا تو منجھو صاحب انگرکھا، ٹوپی، شانوں پر شال اور اپنے بازوؤں کو لے کر مفتی گنج پہنچے سارے شہر میں شہرہ تھا کہ آج میر علی محمد صاحب شہر کے نامی گرامی سوز خوانوں کے مقابلے میں اپنا شاگرد اتار رہے ہیں۔ یہ مجلس ہمیشہ شام ۴ بجے شروع ہوتی اور رات کو ۱۲ بجے ختم ہوتی تھی۔ لاؤڈ اسپیکر وغیرہ تو تھے نہیں اس لیے موسیقی اور سوز خوانی کے متوالے گھر کے کوٹھوں پر بھی جمع ہو جاتے تھے۔ منجھو صاحب میں کچھ باتیں خداداد تھیں، ایک یہ کہ وہ بڑے خوبرو اور گبرو جوان تھے اور

انتہائی جامہ زیب تھے۔ ایک خاص صفت یہ تھی کہ وہ پڑھتے وقت خصوصاً تان لیتے وقت دیگر سوز خوانوں کی طرح منہ نہیں بناتے تھے۔ غرض پہلے ہی دن جب انھوں نے میر انیسؔ کا یہ سلام۔

شبیہ امام زماں کھینچتے ہیں
تصور میں تصویر جاں کھینچتے ہیں

کچھ اس انداز سے پڑھا کہ سارا مجمع کبھی وجد کے عالم میں کھڑا ہو جاتا تھا اور کبھی فرط گریہ سے سروزانو پیٹنے لگتا تھا۔ مجلس اتنی کامیاب ہوئی کہ منجھو صاحب نے جھنڈے گاڑ دیے اور اتفاق رائے سے اس سال کے سب سے اچھے سوز خوان کہلائے اور پھر کئی سال تک کوئی دوسرا سوز خوان ان سے پیش نہیں پا سکا۔

وہ جو اک مثل ہے "ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی" منجھو صاحب کی شہرت منجھو صاحب سے آگے چلنے لگی۔ آج محمود آباد بلائے گئے، کل رام پور اور پرسوں حیدرآباد۔ بعد میں ان تینوں ریاستوں سے ان کے وظیفے مقرر ہو گئے۔[۲۰]

سید اصغر علی شادانی نے اپنی کتاب احوال ریاست رام پور میں والیان ریاست رام پور کے مذہبی عقائد کے عنوان تلے رام پور میں محرم کی رسومات کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"عاشور کے دن قلعے کی مسجد میں نماز فجر کے بعد سے جلوس کی تیاری شروع ہو جاتی تھی۔ جلوس میں فوجی بینڈ باجہ، فوج کے گھوڑسوار مع نقاروں کے اور اس کے علاوہ پیدل فوج کے دستے ساتھ ہوتے تھے۔ جلوس کا آغاز لکھنؤ کے مشہور سوز خواں میر منجھو صاحب کے اس سوز سے ہوتا تھا

یوں فاطمہ کرتی تھیں بیاں، ہائے حسینا، مظلوم حسینا
تم ذبح ہوئے تشنہ دہاں، ہائے حسینا، مظلوم حسینا

صبح سویرے کا وقت، فضا خاموش، منجھو صاحب کی آواز کی دل سوزی اور اس پر سرکاری بینڈ کا مغموم ساز سننے والوں کے دلوں پر برچھیاں چلاتا تھا۔[۲۱]

منجھو صاحب جب لکھنؤ شہر میں نکلتے تو معلوم ہوتا کہ کوئی شہزادہ چلا آ رہا ہے، یوں تو وہ شہر میں متعدد مجلسیں پڑھتے تھے، لیکن نظیرن کے امام باڑے سے واقع سر کٹا نالہ کی مجلس بڑی

۲۰۔ منجھو صاحب سوز خوان، سلامت رضوی، مشمولہ: نیا دور، جون ۱۹۹۷ء، لکھنؤ، ص: ۲۷ تا ۲۹

۲۱۔ احوال ریاست رام پور، سید اصغر علی شادانی، کراچی، ص: ۲۵۳

مشہور مجلس تھی۔ اس مجلس میں موقع پر چوک کی گانے والیاں اپنا کاروبار دو گھنٹے کے لیے بند کر کے منجھو صاحب کو سننے آتی تھیں۔ امام باڑے کا ایک حصہ چلمنیں وغیرہ ڈال کر ان کے لیے مخصوص کر دیا جاتا تھا۔

منجھو صاحب کی شادی میر علی محمد کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنے استاد اپنے ماموں اور اپنے خسر معظم سے جو عہد کیا تھا کہ زبان کو ذکر محمدؐ و آل محمد کے سوا اور کے ذکر سے آلودہ نہیں کروں گا اس پر ساری زندگی قائم رہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حیدرآباد میں نظام دکن نے ان سے یہ فرمائش کی کہ نظام کی ایک غزل طبلے کی تھاپ پر گائیں، تو انھوں نے برجستہ جواب دیا:

''حضور عالی تعالیٰ! اس ناچیز نے یہ فن اختیار کرتے وقت اپنے استاد محترم کے سامنے یہ قسم کھائی تھی کہ مدح محمدؐ و آل محمد کے سوا کسی اور کلام سے اپنی زبان کو آلودہ نہ کرے گا۔ لہٰذا حضور یا تو غزل کی بجائے مجھے سلام عنایت فرما دیں یا پھر یہ حکم دیں کہ میں اپنی قسم توڑ دوں''۔

نظام اس جواب سے بہت خوش ہوئے۔ ''نکو، نکو'' کہا اور سلام دینے کا وعدہ کیا۔

منجھو صاحب نے ۷ اجنوری ۱۹۴۲ء مطابق ۲۹ ذی الحجہ ۱۳۶۰ھ انتقال کیا اور کربلائے تال کٹورہ میں تدفین ہوئی ۲۲

محمد علی خان نے اپنی کتاب ''تذکرۂ ذاکرین'' میں لکھنؤ کے بعض ایسے سوزخوانوں کا ذکر بھی کیا ہے جو ہندوستان کی تقسیم سے پہلے سوزخوانی کے لیے حیدرآباد (دکن) تک بلائے جاتے تھے۔ ان سوزخوانوں میں میر فدا علی، میر حمزہ علی، عابد علی، مرزا اچھے صاحب، سید سجاد حسین، نادر صاحب، منجھو صاحب اور بندہ حسن کے نام شامل ہیں ۲۳۔ منشی محمد کرم امام خان نے اپنی کتاب ''معدن الموسیقی'' میں بھی بیسویں صدی کے اوائل کے چند معروف سوزخوانوں کے نام رقم کیے ہیں جن میں احمد علی خان، اصغر علی خان، میر کاظم علی، مرزا محمد رضا اور میر ببر علی کے نام شامل تھے ۲۴

استاد منجھو صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد ان کے شاگرد رشید جناب زندے رضا صاحب کو سالانہ مجلس میں قصبہ جانسٹھ ضلع مظفر نگر سادات بارہہ میں مدعو کیا۔ یہ گرمی کے ایام تھے امام

---

۲۲ منجھو صاحب سوزخوان، سلامت رضوی، مشمولہ: نیا دور، جون ۱۹۹۷ء، لکھنؤ، ص: ۲۷ تا ۲۹

۲۳ تذکرۂ ذاکرین، محمد علی خان، حیدرآباد (دکن)، ۱۳۶۱ھ (۱۹۴۲ء)، ص: ۱۹۶ تا ۲۰۳

۲۴ معدن الموسیقی، منشی محمد کرم امام خان، لکھنؤ، ۱۹۲۵ء، ص: ۵۳

باڑے کے صحن میں شامیانے لگے ہوئے سامعین کثیر تعداد میں موجود تھے۔ اس زمانے میں ہم سب ایک جگہ بیٹھا کرتے تھے۔ ایک صاحب تھے کہ جو علم موسیقی کے ماہر تھے، نواب حامد علی خان والیٔ رام پور ان کی قدر کرتے تھے مگر کچھ عرصہ قبل انھوں نے توبہ کر لی تھی اب گنگناتے بھی نہیں تھے اور نہ ہی کسی سوز خوان کو کبھی داد دیتے تھے مجلس میں سر جھکائے بیٹھے سنتے رہتے تھے۔ زندے صاحب نے رباعی کا پہلا مصرع پڑھا تو ان صاحب نے سر اُٹھا کر بے ساختہ داد دی۔ ان کے ہم نشین چونکے اور انھیں تعجب سے دیکھ کر کہا کہ آج پتھر میں جونک لگ گئی۔ مگر ان صاحب کو کچھ خبر نہیں کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ دو شامیانوں کے درمیان کچھ فاصلہ تھا یہ حضرت محویت کے عالم میں داد دیتے جاتے اور بار بار آسمان کی طرف دیکھتے جاتے۔ بالآخر چوتھے مصرع کی ادائی پر شامیانہ ٹپک رہا تھا۔ اب ان حضرت نے اپنے ہم نشینوں سے کہا کہ کم بختو تمھیں کیا معلوم اتنے بھرپور سُر لگ رہے تھے کہ میں سوچ رہا تھا کہ بارش ابھی تک کیوں نہیں ہوئی۔ یہ تھے جناب زندے صاحب مگر پھر بھی اپنے استاد مرحوم کا مقام حاصل نہ کر سکے"۔[۲۵]

منجھو صاحب کے ایک اور شاگرد ولی حیدر ولی تھے۔ ولی حیدر ولی ۱۹۰۸ء میں پٹنہ میں پیدا ہوئے تھے۔ نہایت کم عمری میں وہ لکھنؤ چلے آئے اور مستقل طور پر یہیں کے ہو گئے۔ ۱۹۲۸ء میں انھوں نے منجھو صاحب سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ گلے میں سُر تھا، دن رات کی محنت سے فطری صلاحیتیں بیدار ہوئیں اور جلد ہی ایک اچھے سوز خوان بن کر ابھرے۔ ابتدا میں کچھ عرصے تک منجھو صاحب اپنی مجالس میں ان کو پیش خوانی کے لیے ساتھ رکھتے تھے اور کبھی کبھی ان کو اپنا نائب بنا کر ان مجالس میں بھیج دیا کرتے تھے جہاں خود انھیں سوز خوانی کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ لکھنؤ کے مشہور امام باڑوں اور معزز حضرات کے عزا خانوں میں ولی حیدر ولی کی سوز خوانی کا سلسلہ سال ہا سال جاری رہا۔ انھیں لکھنؤ، دہلی، بمبئی، اور رام پور ریڈیو اسٹیشن سے بھی سوز خوانی کے لیے مدعو کیا گیا اور محمود آباد، رام پور اور حیدرآباد (دکن) کے امرا بھی ان کی سوز خوانی سے فیض یاب ہوئے۔ ۱۱۰ کتوبر ۱۹۹۱ء کو ولی حیدر ولی خالق حقیقی سے جا ملے اور امین الدولہ امداد حسین خان کی کربلا میں آسودۂ خاک ہوئے۔[۲۶]

---

[۲۵] سوز خوانی: سعید حیدر زیدی سعید، مشمولہ: "اردو زبان اور اردو مرثیہ" سید اقبال حسین کاظمی، ۲۰۱۸ء، کراچی، ص: ۱۸۶، ۱۸۷

[۲۶] سوز خوانی، تاریخ و تذکرہ، سید سکندر آغا، ڈاکٹر۔ لکھنؤ۔ ۱۹۹۹ء، ص: ۲۷۵ تا ۲۸۷، تلخیص

چوتھا باب

سوز خوانی کے عناصر

ممتاز شاعر اور سوز خوان سبط جعفر زیدی نے اپنی کتاب "صوتی علوم و فنون اسلامی" میں سوز خوانی کے فن پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"سوز کے لفظی و لغوی معنی درد، تکلیف، جلن، رنج و غم وغیرہ کے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے اردو داں طبقہ میں فضائل و مصائب اہل بیت اور بالخصوص کربلا اور شام و کوفہ کے واقعات شہادت و اسیری بلکہ ۲۸ رجب ۶۰ ھ کو مدینہ منورہ سے امام حسین اور ان کے متعلقین کی روانگی سے اس لٹے پٹے قافلہ کی مدینہ واپسی تک کے منظوم واقعات کو لحن اور مخصوص بندشوں اور متعین طریقوں میں ادائی کو سوز خوانی کہا جاتا ہے۔ اس طرح سوز خوانی وہ واحد صنف ادائی ہے کہ جو عزاداری سید الشہدا سے مخصوص ہے اور اس کی موجودہ ہیئت برصغیر کی اختراع ہے"۔

"برصغیر کے اردو داں عزاداروں میں اسے لازمی و بنیادی اہمیت، مجلس عزا کا نقطہ آغاز اور تکبیرۃ الاحرام کا درجہ حاصل ہے۔ یوں تو مجلس عزا کا آغاز تلاوت قرآن مجید و حدیث کساء سے بھی کیا جاتا ہے لیکن مجلس کا باقاعدہ آغاز اسی سوز خوانی سے ہوتا ہے"۔

سبط جعفر زیدی مزید بتاتے ہیں کہ:

"سوز خوانی میں رباعی، قطعہ، سوز، سلام، بین اور مرثیہ پڑھا جاتا ہے۔ تاہم ضروری نہیں ہے کہ ہر مجلس میں یہ تمام ارکان ادا کیے جائیں۔ اگر یہ تمام ارکان ادا کیے جائیں تو مکمل سوز خوانی کا معیاری دورانیہ تقریباً آدھا گھنٹہ ہوتا ہے۔ لیکن اب چوں کہ مجلس کا دورانیہ سمٹ کر محدود ہوتا جا رہا ہے تو موقع محل کی مناسبت سے ان ارکان میں کمی کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور بالعموم ایک سوز اور مرثیہ کے چند بند پڑھنا ضروری ہوتے ہیں۔ یوں ہم سوز اور مرثیہ کو سوز خوانی کے لازمی اجزا قرار

دے سکتے ہیں۔ اگرچہ سلام بھی ایک اہم رکن ہے جس سے مجلس اور سوز خوانی میں رونق اور خوب صورتی آ جاتی ہے۔ تاہم بوقت ضرورت اسے محدود کیا جاسکتا ہے۔ سوز اور مرثیہ بہر حال سوز خوانی کے لازمی اجزا ہیں جن کے بغیر سوز خوانی اور مجلس نامکمل اور تشنہ سمجھی جاتی ہے۔

رباعی/ قطعہ

سوز خواں سب سے پہلے بہاریہ یا عارفانہ کلام و پیغام پر مبنی رباعی/ قطعہ پڑھتا ہے رباعی تو ہوتی ہی چار مصرعوں پر مشتمل ہے تاہم قطعہ بھی بالعموم دو اشعار پر مبنی ہوتا ہے۔ پہلے بہاریہ و مدحیہ کلام پڑھا جاتا ہے اس کے بعد الیہ و بینیہ۔ عام طور پر رباعی و قطعہ اور بہاریہ و مدحیہ کلام ہی پہلے پڑھا جاتا ہے۔ جس کے بعد سوز کا نمبر آتا ہے۔ (رباعی اور قطعہ میں باعتبار ادائی کوئی فرق نہیں بلکہ شاعری کا تکنیکی فرق ہے۔) بالعموم اس میں بھی سوز خواں اپنے بازوؤں سے آس لے کر تمام کلام تنہا ادا کرتا ہے اور کلام کے پیغام و مزاج کے مطابق بندش سوزوں و منتخب کرتا ہے۔

سوز

''سوز'' دراصل مسدس/ مرثیہ کا چھ مصرعوں پر مشتمل ایک بند ہوتا ہے تاہم دو یا تین بند بھی پڑھے جاسکتے ہیں بالعموم سوز میں بھی بازو آس دیتے ہیں اور سوز خواں تنہا کلام کی ادائی کرتا ہے اور کلام زیادہ تر مبکی و بینیہ یعنی بیان مصائب پر مشتمل ہوتا ہے۔ سوز خوانی میں اسے اتنی اہمیت اور کلیدی حیثیت حاصل ہے کہ سوز خواں اگرچہ قطعہ، رباعی، سلام، مرثیہ سبھی کچھ پڑھتا ہے مگر کہلاتا سوز خواں ہے اور کسی سوز خواں کو جانچنے و ماپنے کا بنیادی پیمانہ سوز ہی ہوتا ہے۔

سلام/ بین

بعض کلام کو شاعری اور ادائی کے اعتبار سے سلام یا قطعہ رباعی سوز و مرثیہ کا نام نہیں دیا جاسکتا لیکن چوں کہ شاعری و ادائی کے لحاظ سے وہ تکنیکی طور پر سلام اور نوحہ سے قریب تر ہوتا ہے اور سوز خوانی کے دوران و درمیان اس جگہ پڑھا جاتا ہے کہ جہاں سلام پڑھا جاتا ہے اس لیے بھی اسے سلام کا قائم مقام یا متبادل قرار دیا جاسکتا ہے۔ سوز خوان اسے بین کا نام دیتے ہیں مثلاً یہ کلام:

''کہیں بانو میں بیکس نواؤں کہاں............

بندش کے اعتبار سے آپ اسے سوز خوانوں کا نوحہ یا نوحہ خوانوں کی سوز خوانی قرار دے سکتے ہیں۔

مرثیہ سے پہلے سلام کا نمبر آتا ہے اس میں چوں کہ فضائل و مصائب دونوں ہی ہوتے ہیں اس لیے اس کی بندش میں دونوں انداز ادائی یعنی اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ بندش ایسی ہو جو فضائل و مصائب مدحیہ بہاریہ والمیہ ہر طرح کی ادائی کا حق ادا کر سکے۔ اس میں حسب موقع چار سے دس اشعار تک پڑھے جاسکتے ہیں۔ اس میں کچھ کلام مثلاً مصرع اولیٰ کا پہلا جزو یا پورا مصرع یا اس کا حصہ سوز خواں تنہا ادا کرتا ہے بقایا میں بازو پہلا مصرع یا اس کا ابتدائی حصہ سوز خواں تنہا پڑھتا ہے۔ اسی طرح ہر شعر کا پہلا مصرع یا اس کا ابتدائی حصہ سوز خواں تنہا ادا کرتا ہے (یعنی انترا کا ابتدائی حصہ) پھر تمام بازو ساتھ پڑھواتے ہیں۔ یہ بڑا بھرپور اور موٴثر جزو ارکن ہوتا ہے جس سے مجلس اور سوز خوانی میں بڑی رونق آجاتی ہے تاہم وقت کی کمی کے پیش نظر اسے مختصر کیا جاسکتا ہے۔ بعض اوقات مرثیہ کی بجائے بین یا سلام کے بیتیہ/سکی اشعار پر بھی سوز خوانی کو ختم کر دیا جاتا ہے اور مرثیے کی نیابت ہو جاتی ہے۔

مرثیہ

سوز کے بعد اسے بنیادی اہمیت اور کلیدی حیثیت حاصل ہے قطعہ رباعی سلام حتیٰ کہ سوز بھی نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ مگر مرثیہ کے بغیر بالعموم مجلس اور سوز خوانی تشنہ رہ جاتی ہے خواہ تین چار بند ہی پڑھے جائیں مگر حسب ضرورت موقع محل کی مناسبت سے مرثیہ پڑھنا ضرور چاہیے۔ مرثیہ سے قبل سوز خواں اپنی فنی مہارت اور مرثیہ میں فنی صلاحیت و استعداد کی بجائے صرف پُرسہ مقصود ہوتا ہے جسے مآل مجلس قرار دیا جاتا ہے اس میں سوز خواں اور تمام بازو بھرپور طور پر ہم آواز ہو کر پُرزور و موٴثر انداز اور بلند آہنگ میں کلام کی ادائی کرتے ہیں اور آس صرف کلام شروع کرنے کے لیے چند ثانیوں کی حد تک محدود ہوتی ہے، اگرچہ بعض گھرانوں کے اساتذہ مرثیہ میں بازوؤں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے کچھ سے آس اور کچھ سے کلام کی ادائی کا کام لیتے ہیں تاہم بالعموم مرثیہ میں آس کا رواج نہیں ہے اور ساری توجہ کلام کی ادائی بیان اور مصائب پر مرکوز ہوتی ہے۔

بعض مقامات اور گھرانوں میں سوز خوانی اور مرثیہ خوانی اپنی ادائی کی وجہ سے فنی و تکنیکی طور پر دو مختلف چیزیں تصور کی جاتی ہیں۔ سوز خواں و مرثیہ خواں کے فرق کو اودھ اور دکن والے بخوبی سمجھتے ہیں۔ جہاں "آس" کے ساتھ پڑھنے والوں کو سوز خواں کہا جاتا ہے مگر یہ علیحدہ بحث ہے[1]

---

[1] سبط جعفر زیدی، بستہ، ادارہ ترویج سوز خوانی، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص: ۱۹ تا ۲۲

پانچواں باب

سوزخوانی: حرف وصوت

سوزخوانی کی ابتدا سے ہی یہ بحث موجود ہے کہ گائیکی اور سوزخوانی میں بنیادی فرق کیا ہے۔
استاد اشتیاق علی خان حیدری کے بقول گائیکی میں الفاظ کا سہارا اور استعمال بطور آلہ لیا جاتا ہے جبکہ سوزخوانی میں سُر ابلاغ و اظہار کا محض ذریعہ اور آلہ ہے۔ استاد معشوق علی خاں حیدری کے بقول گائیکی میں الفاظ سواری ہیں جن کے دوش پر موسیقی سفر کرتی ہے جبکہ سوزخوانی میں سُر اور راگ محض سواری اور الفاظ سوار ہیں اور سُروں کے وسیلے سے سفر کر کے اپنی منزل یعنی سامعین تک رسائی حاصل کرتا ہے۔[۱]

ادیب سہیل نے لکھا ہے کہ:

''سوزخوانی کے حوالے سے اس وقت مجھے نواب سید امداد امام اثر کی تنقیدی و تحقیقی تصنیف کاشف الحقائق یاد آتی جارہی ہے۔ اس کے باب موسیقی میں انھوں نے موسیقی اور غنا کی وساطت سے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک محرم الحرام کے موقع پر نواب اثر کے ہاں ایک ایرانی مجتہد مہمان ہوئے۔ بات سوزخوانی تک پہنچی تو مجتہد صاحب نے کہا کہ ''ہندوی سوز غنا کا حکم واثر رکھتا ہے۔ میں ہندوی سوزخوانی سے احتراز کرتا ہوں''۔ نواب اثر نے مہمان مجتہد سے ہونے والے مکالمات اپنے ایک جاننے والے سوزخوان بندے حسین کو کہہ سنائے۔ انھوں نے جواب میں نواب صاحب کو کہا کہ ''آپ ایک محفل سوزخوانی مرتب کیجیے، میں انھیں سوز سناؤں گا''۔ چنانچہ محفل سوزخوانی مرتب کی گئی۔ بندے حسین آئے اور نواب صاحب کے مہمان مجتہد صاحب کو دھرپد انگ میں سوز سنایا۔ جب بندے حسین کی سوز گائیکی اختتام کو پہنچی تو مجتہد صاحب بے اختیار

---

[۱] مراسمِ عزا اور سوزخوانی، سید جعفر زیدی، مشمولہ: بعد قتل شاہ (مجلہ)، انجمن فدائے اہل بیت، کراچی، ۱۹۹۰ء، ص ۸۲

بول اٹھے: ''بے شک بندے حسین صاحب کی سوز خوانی غنا کا حکم نہیں رکھتی، یہ موسیقی ہے''۲۔

ادیب سہیل نے مزید لکھا ہے کہ:

''سوز تقدس کا نغمہ ہے، اس لیے میر احمد اور دوسرے مقام داں موسیقاروں نے اسے راگ دھرپد میں پیش کرنے کو ترجیح دی۔ دھرپد میں تان، توڑے، پلٹے، زم زے اور دوسرے آرائشی لوازم تاحال ممنوع ہیں۔ یہ گیان دھیان کا نغمہ ہے۔ اس کے گیت کے مضامین میں بھگتی اور معرفت کا وفور ہوتا ہے۔ نواب اودھ کے آخری دور میں خیال اور ٹھمری کے طرز کی ملاوٹ نے سوز کے تقدس کو نقصان پہنچایا شاید اسی لیے ایرانی مجتہد صاحب ہندوی سوز خوانی سے برگشتہ ہو گئے اور انھوں نے اپنے میزبان شمس العلما نواب امداد امام اثر سے کہا کہ میں ہندوی سوز نہیں سنوں گا یہ غنا کا حکم رکھتا ہے''۳۔

سبط جعفر زیدی اپنی کتاب ''صوتی علوم و فنون اسلامی'' میں دن اور رات کے مختلف اوقات میں کی جانے والی سوز خوانی کے کلام، بندشوں اور راگوں کی سوزونیت پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''مجالس عزا عام طور پر صبح دس، گیارہ بجے، سہ پہر چار، پانچ بجے یا نماز مغرب اور عشا کے بعد شروع ہوتی ہیں۔ اس طرح سوز خوانی کے عمومی اوقات یہی ہیں چنانچہ وقت کی مناسبت کو مدنظر رکھتے ہوئے نیز کلام اور اس کے مزاج و تاثر کو دیکھتے ہوئے بندش موزوں کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں وقت اور ماحول کی مناسبت سے بندش میں حسب ضرورت ترمیم و اضافہ بھی کر لیا جاتا ہے۔ جو مجلس دوپہر سے پہلے (دس، گیارہ بجے) ہوتی ہے اس میں ایسے سوز موثر ہوتے ہیں جس میں کومل اور تیور دونوں سُروں کا متناسب استعمال کیا گیا ہو۔ اس وقت کے سُروں میں گندھار، مدھم، دھیوت اور نکھاد شامل ہیں۔ سوبھیروں، بھیرویں، بلاول اور دیسکار وغیرہ پر مبنی سوز سامعین پر فطری طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دوپہر اور بعد دوپہر عام طور پر مجلس کا آغاز یعنی سوز خوانی نہیں ہوتی اور سوز خوانی کا وقت سہ پہر یا شام کا ابتدائی وقت چار سے چھ کے درمیان ہوتا ہے چنانچہ اس

۲؎ کاشف الحقائق، سید امداد امام اثر۔ بحوالہ: ''مرثیہ و سوز خوانی میں موسیقی و غنا کا فرق و استعمال، عہد انیس سے عہد حاضر تک''، ادیب سہیل، مشمولہ: رثائی ادب، کراچی (انیس نمبر)، شمارہ: ۲۷، ۲۸، ۲۰۰۲ء، ص: ۵۱۳

۳؎ ادیب سہیل: ''مرثیہ و سوز خوانی میں موسیقی و غنا کا فرق و استعمال، عہد انیس سے عہد حاضر تک''، مشمولہ: رثائی ادب، کراچی (انیس نمبر)، شمارہ: ۲۷، ۲۸، ۲۰۰۲ء، ص: ۵۱۳

وقت کی مناسبت سے ایسے سوز اور سُروں کا انتخاب کیا جاتا ہے جو پوریا مارووا، پوریا دھناسری، بسنت، پوریا کلیان، بسنت بہار وغیرہ سے متاثر ہوں۔ یعنی رکھب اور دھیوت کومل مگر گندھار، مدھم اور نکھاد تیور ہوں۔ اس کے بعد سوزخوانی کا تیسرا وقت نماز مغرب اور عشا کے بعد یعنی اول شب ہوا کرتا ہے۔ اس میں ایسے سوز اور سُروں کا استعمال کیا جاتا ہے کہ جس میں شدھ راگ تیور سروں کے ساتھ مستعمل ہوں۔ مثلاً کدارا، ایمن کلیان، بھوپالی، شدھ کلیان وغیرہ ھم اس کے بعد مجلس کا چوتھا اور آخری وقت رات نو، دس بجے کا ہوتا ہے اس وقت تمام سُر تیور لگتے ہیں مگر گندھار، مدھم اور نکھاد کومل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً درباری، عارہ، جے جے ونتی، باگیشری، میاں کی ملہار وغیرہ ھم۔ عام طور پر مجالس کے اوقات یہی ہیں جو بیان کیے گئے ہیں۔ اس لیے انھیں اوقات کے راگ راگنیاں سوزخوانی میں زیادہ تر مستعمل و مروج ہیں اگرچہ بعض اوقات، وقتی مناسبت سے قطع نظر محض کلام کی مناسبت سے بندش مرتب کی جاتی ہے اور اس بندشوں کو وقت کی پابندی کے بغیر ہمیشہ ایک ہی طرح سے پڑھا جاتا ہے اس لیے کہ سوزوں کی بندش ترتیب دیتے وقت متعلقہ راگ راگنیوں کی تشبیہات اور فرضی اشکال بھی ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔

راگ میگھ کی شبیہ میں ایک وجیہہ و شکیل فربہ اندام جوان رعنا، شمشیر برہنہ کے ساتھ دکھایا جاتا ہے اور تقریباً یہی تاثر اس شبیہ میں بھی پایا جاتا ہے جو راگ جونپوری سے منسوب ہے، اگرچہ ایک ہی محبوب کا انتظار اور دوسرے میں رقیب سے دو دو ہاتھ کرنے یعنی نمٹنے کی حسرت بھی پائی جاتی ہے مگر بنیادی تاثر جوان رعنا کے جلال و شجاعت کے مظاہرہ کی آرزو ہے ان شبیہوں کی متقابل اور شایان شان شخصیات جو کربلا میں ملتی ہیں یوں تو ان کی تعداد کہیں زیادہ ہے کہ کربلا قربانی اور استقامت کے علاوہ عزیمت و جواں مردی کی علامت و استعارہ ہے لیکن مندرجہ بالا الفاظ اور شبیہوں سے جو شبیہ اور شخصیت فوری اور بھرپور و موثر طور پر ابھرتی ہے وہ حضرت عباس علمدار ہے چنانچہ استاد معشوق علی خان مرحوم اور استاد اشتیاق علی خان مرحوم کے بزرگوں (استاد عاشق علی خان مرحوم، استاد صادق علی خان مرحوم، استاد مشتاق علی خان مرحوم اور استاد کاظم علی خان مرحوم وغیرھم) نے راگ جونپوری میں اس سوز کو موزوں (کمپوز) کیا۔

جب مشک بھر کر نہر سے عباس غازی گھر چلے
اک جامِ کوثر بھر لیا اور خلد سے حیدر چلے

ہمراہ پیغمبر چلے، حمزہ چلے، جعفر چلے
میداں کا رستہ روکنے، کفار کے لشکر چلے
آئی گھٹا سی فوج کیں، کالے علم کھولے ہوئے
عباس جھپٹے شیر سے تیغ دودم تولے ہوئے

جن حضرات نے استاد معشوق علی خان حیدری و استاد اشتیاق علی خان حیدری سے یہ سوز سنا ہے وہ تصدیق کریں گے کہ ہر لفظ کو اس کے استحقاق (Merit) پر ادا کیا گیا ہے۔ کلام بندش اور اس کے شایان شان ادائی سے عباس غازی، حیدر، حمزہ اور جعفر کی ادائی میں ان علمدارانِ اسلام کے جاہ وجلال کا نقشہ ابھر کر سامنے آتا ہے اور آنکھوں میں صوتی تصویر پھر جاتی ہے۔ جبکہ لفظ ''پیغمبر چلے'' کی ادائی میں تمام تر سبک روی اور ٹھہراؤ پایا جاتا ہے۔ اسی طرح استاد واحد حسین خان نے میگھ میں ایک سوز کی بندش سوزوں کی۔

شور ہے شام کے لشکر میں کہ عباس آئے
اور تواتر خبر آئی کہ بہت پاس آئے
بہ غم شاہ شہیداں سے بصد یاس آئے
بولی تقدیر کہ یہ جنگ انہیں راس آئے

بڑھ کے گھوڑے کا شجاعت نے قدم چوم لیا
فتح نے گوشہ دامانِ علم چوم لیا

اس کلام میں طنطنہ، ولولہ، جوش وخروش یعنی رعب وجلال اور رزمیہ کیفیت پائی جاتی ہے چنانچہ راگ اور سروں کا انتخاب بھی اسی نسبت اور توازن سے کیا گیا ہے جو ہر سامع پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

اسی طرح راگ بھیم پلاسی میں اگرچہ مصیبت کا تاثر پایا جاتا ہے مگر اس آزمائش میں بھی ہمت وعزیمت کی ترغیب ملتی ہے اور مصیبت وپسپائی کا احساس وقتی ومقامی ہوتا ہے نہ کہ ابدی و دائمی، جیسا کہ کنور خالد محمود اور عنایت الٰہی ملک نے بھی اپنی مرتبہ کتاب ''سُر سنگیت'' میں بھی کسی قدر صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے چنانچہ اس راگ راگنی کے مزاج اور تاثر کو دیکھنے کے بعد کربلا کا میدان سامنے آگیا اور استاد معشوق علی خان اور استاد اشتیاق علی خان کے بزرگوں نے رثائی

ادب پر نگاہ ڈالنے کے بعد کلام کا انتخاب کیا اور پہلے متعلقہ راگ کے غیر متعلق و غیر ضروری اجزا یعنی آلائش طرب کو الگ کر کے کلام و بندش کے حسین امتزاج سے ایک بڑی متاثر کن شکل پیش کردی جو صرف مذکورہ اساتذہ ہی پڑھا کرتے تھے، بھیم پلاسی کا تاثر آپ نے پڑھ لیا اب کلام بھی ملاحظہ فرمائیں۔

تسبیح فاطمہ جو ادا کی امام نے
جاسوس نے خبر یہ کہی آ کے سامنے
کی سیر گھاٹ گھاٹ کی اِس ذم غلام نے
آبِ رواں بھی بند کیا فوجِ شام نے
فوجِ خدا کو نہر سے دوری نصیب ہے
شہ بولے کیا مضائقہ، کوثر قریب ہے

استاد اشتیاق علی خان ایک رباعی پڑھا کرتے تھے جس میں نہ خوشی کا تاثر ہے نہ ہی غم کا۔ آہ اور واہ کی درمیانی ملی جلی کیفیت کا حامل یہ کلام جس بندش میں پڑھا جاتا ہے وہ سننے سے تعلق رکھتی ہے اس کلام میں ایک لفظ چاند خوب صورت اور مترنم ہے چنانچہ تمام تر رنگینی اور لطافت اس ایک لفظ میں سمو دی گئی ہے جو سننے والے پر بھرپور تاثر چھوڑتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

عابد نہ کبھی رنج و محن سے نکلا
نکلا بھی تو بس شکر دہن سے نکلا
بیمار نے پہنی جونہی کالی پوشاک
سب نے جانا کہ ہے یہ چاند گہن سے نکلا

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ عام سوز خوانی یا ہر سوز خوان کے لیے ان تکنیکی رعایتوں، نزاکتوں اور مہارتوں یعنی باریکیوں کا لحاظ اور علم ضروری نہیں ہے لیکن کسی اہتمام کے بغیر بھی عام مجلسی انسان بھی فنِ موسیقی سے ناواقفیت کے باوجود کلام و بندش کے باہمی تعلق و تلازم، توازن و تناسب اور موزونیت و مناسبت سے آگاہی رکھتا ہے اور سوز خوان کے پیش نظر بندش یا طرز کی بجائے کلام و پیغام اور مجلس و سامعین کی ضرورت و ماحول ہی ہوتا ہے کہ سوز خوان و سوز خوانی کا مقصد و مقصود اور مدعا گائیکی و ادائی کی مہارت کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ پیغام کا مؤثر اور واضح ابلاغ

ہوتا ہے۔ چنانچہ جب کلام کی بندش موزوں کی جاتی ہے تو بعض اوقات متعلقہ راگ راگنیوں سے راگ کے بنیادی و لازمی اجزا بھی علیحدہ کر دیے جاتے ہیں۔ یعنی آلائش طرب یا غیر متعلقہ وغیرہ ضروری سُروں کو الگ کر کے کلام کی ضرورت اور مناسبت کے پیش نظر مختلف اور اضافی سُر بھی شامل کر دیے جاتے ہیں۔ یوں اصل راگ راگنی کی شکل تبدیل ہو جاتی ہے۔ اگر چہ یہ پیوندکاری کلاسیکی موسیقی و گائیکی میں بھی ہوتی رہی ہے۔ جس سے مختلف ٹھاٹھ، راگ اور سینکڑوں راگنیاں وجود میں آئی ہیں۔ تاہم سوزخوانی میں سُروں کی آمیزش اور پیوندکاری کی وجہ سے بندش مروجہ نظام وموسیقی یعنی ٹھاٹھ اور راگوں کی تقسیم میں متعین نہیں کی جا سکتی اور قدرے مختلف و ممیز دکھائی دیتی ہے چنانچہ اکثر سوزوں کی بندش کے بارے میں مستند اساتذہ میں بھی مدلل اختلافات پائے جاتے ہیں اور یہ اختلاف اتنا واضح اور متضاد ہے کہ ایک سوز کو ایک ماہر فن سارنگ سے مشتق و ماخوذ بتا رہا ہے تو اسی بندش کو دوسرا استاد کلیان سے متاثر قرار دے رہا ہے جبکہ نہ وہ سارنگ نہ کلیان کہ تیسرا فریق اسے ایمن کی شاخ گردانتا ہے لیکن جب خود صاحب بندش (کمپوزر) سے پوچھا گیا تو اس نے بتایا بندرابنی سارنگ یہ اختلاف اس سوز کے بارے میں بھی پایا جاتا ہے

جب بانو نے رن کی علی اکبر کو رضا دی

اس اختلاف کی وجہ ہی کو ہم کلاسیکی موسیقی پر سوزخوانی کے اثرات و احسانات میں شمار کرتے ہیں اور وہ یہ کہ سوزخوانی کے ماہرین فن اساتذہ نے کلام کے ابلاغ اور پیغام کے مزاج کو فوقیت دی اور بندش کے تاثر سے استفادہ کر کے اسے نیا رنگ اور آہنگ عطا کیا ایسا اس لیے بھی ضروری تھا کہ ہماری مقامی و قدیم روایتی ہندوستانی کلاسیکی موسیقی و گائیکی کی بنیاد آریائی تہذیب اور دراوڑی ثقافت اور ہندو دیومالائی داستانیں اور قصے کہانیاں یعنی مقامی رسومات و روایات تھیں جبکہ مسلمان نہ صرف عربی، فارسی، زبان و ادب بلکہ ایک جداگانہ تہذیب و ثقافت اور تاریخ اور جیتی جاگتی لازوال حقیقی کہانیاں اور قربانی و ایثار کی داستانیں اپنے ساتھ لائے تھے۔ خالص دھرپد اور بھیرویں میں دیوی دیوتاؤں کو تو خراج عقیدت پیش کیا جا سکتا ہے لیکن حقیقی اکابر اسلام اور مقدس ہستیوں کو نہیں۔ پھر خالص میگھ اور جونپوری میں مہابھارت اور رامائن کے کرداروں اور کوروں پانڈوں کا ماحول اور منظر کشی تو ممکن ہے۔ غزوات اور کربلا کی داستانِ عزیمت و استقامت کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ الور و جے پور گھرانوں کے متذکرہ بالا اساتذہ کے علاوہ ماضی قریب کے

نامور اساتذہ سوز خوان آغا مقصود مرزا، عظیم الحسن، آفتاب علی کاظمی، محترمہ گجن بیگم، اختر وصی علی، آباد محمد نقوی اوران کے بعد زوار حسین اور خودستائی پر محمول نہ کیا جائے تو خود اس احقر کی مرتب و موزوں کی ہوئی بعض بندشوں میں کلام و بندش کے ارتباط سے جو مجموعی تاثر ابھرتا ہے اسے کلاسیکی موسیقی وگائیکی کے مروجہ پیمانوں میں ناپنا ماپنا اور جانچنا پرکھنا بہت مشکل ہے اور وجہ یہی ہے کہ کلاسیکی موسیقی اور قدیم مقامی تاریخی وثقافتی ورثہ اور دیو مالا بلکہ ثقافت وتاریخ کے عالمی ورثہ میں بھی ایثار وقربانی اور مظلومیت وعزیمت کی ایسی حقیقی اور سچی بے مثال ولازوال داستانیں موجود نہیں جو کربلا نے پیش کی ہیں چنانچہ ان جذبوں اور قربانیوں کے اظہار وبیان سے دنیا کی ہر زبان و ادب اور تہذیب وثقافت محروم ہے۔ سوائے اسلام اور مسلمانوں سے متعلق زبانوں کے (مثلاً عربی، فارسی، ہندی، اردو اور برصغیر میں بولی جانے والی مسلمانوں کے زیر استعمال دوسری زبانیں اور بولیاں خصوصاً پنجابی، سرائیکی، سندھی، بشمول گجراتی، پشتو، بلوچی اور براہوی ہندکو وغیرہ)۔

واقعاتِ کربلا یعنی شہادت اور اسیری اہل بیت وانصار واعوان رضوان اللہ علیہم اجمعین کی قربانیوں اور بیان مصائب کے لیے سُروں کی ترتیب وانتخاب نے راگ راگنیوں کے نئے رنگ انگ اور آہنگ ایجاد واختراع کیے اس ضمن میں شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے موسیقی اور کربلا کے تناظر میں کچھ نئے راگ راگنیاں خودان کی اپنی زبان میں "سر" ایجاد کیے بلاشبہ آپ کے ترتیب دیے اور موزوں کیے ہوئے سر کلاسیکی موسیقی وگائیکی کے ناقابل فراموش فن پارے ہیں۔ جنھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جن میں سوز اور ساز بدرجہ کمال جلوہ گر ہیں خصوصاً کیڈارو۔

سوزخوانی نے نہ صرف فنی وتکنیکی طور پر کلاسیکی موسیقی کو نئی بندشیں اور رنگ انگ آہنگ عطا کیے بلکہ حساس ونازک اور پاکیزہ جذبات واحساسات کے اظہار کے لیے پر درد و پرسوز انداز و اطوار اور ادائی کے منفرد آداب عطا کیے اور اس تفریحی بے مصرف و بے مقصد غیر اطلاقی اور کسی حد تک بازاری نیز شرعی اعتبار سے متنازع علم وفن اور شجر ممنوعہ کو مذہبی وادبی تقدس ومقام اور تحفظ و دوام عطا کیا اور نہ صرف دنیاوی طور پر محترم ومعزز مقام ومنصب عطا کیا بلکہ دینی واُخروی توشہ و ذریعہ نجات بھی بنادیا ورنہ بھیرویں جو مذہبی شخصیات اور عبادت گاہوں کے خراج اور نذرانہ عقیدت کی رگ راگنی تھی وہ بھی نامکمل وناقص تھی جبکہ سوزخوانی کی بندشیں ہر قسم کے انگ رنگ اور

آہنگ خصوصاً سوز اور اثر کا بہترین وشاندار خزینہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آواز وریاض کا حامل کامل وماہر اور مشاق گویا بھی ممکن ہے کہ سوز خوانی کا حق ادا نہ کر سکے لیکن ماہر ومشاق سوز خواں ہر قسم کی گائیکی وادائی اور گلوکاری کی اہلیت وصلاحیت ضرور رکھتا ہے‘‘ ؎۴

سبط جعفر زیدی کے ان بیانات کی تائید ڈاکٹر نیرّ مسعود کے مضمون ’’سوز خوانی: حرف و صوت‘‘ سے بھی ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

’’دھیرے دھیرے سوز خوانی میں راگ راگنیوں کا عمل دخل بڑھنے لگا۔ لیکن سوز خوانی کے استادوں نے اپنے اوپر یہ شرط عائد کرلی کہ ان کی خوانندگی پر کلاسیکی گائیکی کے خیال، دھرپد وغیرہ کا دھوکا نہ ہونے پائے۔ یہ بہت کڑی شرط تھی جس کو استاد سوز خوانوں نے بہ احسن وجوہ پورا کیا۔ موسیقی کے بعض استاد مثلاً عبدالکریم خاں، رجب علی خاں، فیاض خاں وغیرہ سوز خوانی بھی کرتے تھے لیکن اس میدان میں شہرت حاصل نہ کر سکے۔ استاد بڑے غلام علی خاں سے یہ قول منسوب ہے کہ سوز خوانی ہماری گائیکی سے زیادہ مشکل فن ہے‘‘ ؎۵

ڈاکٹر نیرّ مسعود نے مزید لکھا ہے کہ:

’’ماہر سوز خوان طرح طرح کے فنی کمال دکھاتے تھے۔ کبھی ایک ہی مرثیہ کے ہر بند یا ایک ہی بند کے ہر مصرعے کی بندش ایک الگ راگ میں ہوتی تھی۔ اس کے لیے ’’راگ ساگر‘‘ کی اصطلاح مقرر تھی۔ اس خوانندگی میں مختلف راگوں کو بڑے کمال کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا جاتا تھا۔ نادر صاحب سوز خوان نے ایک مجلس میں سامعین کو مخاطب کر کے کہا، ’’اب میں رجز کا ایک بند پڑھتا ہوں، اگر تحت اللفظ کا لطف آئے تو درود پڑھے گا۔‘‘ سوز خوانی اور رجز میں بعد المشرقین ہے، لیکن نادر صاحب نے وہ بند اس ڈپٹ اور کڑک کے ساتھ ادا کیا کہ ساری مجلس درود پڑھنے لگی‘‘ ؎۶

ڈاکٹر نیرّ مسعود نے ذخیرۂ مسعود حسن رضوی ادیب میں موجود رثائی ادب کے ایک قلمی مجموعے کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

؎۴ صوتی علوم وفنون اسلامی، سبط جعفر زیدی، ۱۹۹۵ء، کراچی، ص ۷۶ تا ۸۲

؎۵ سوز خوانی: حرف وصوت، ڈاکٹر نیرّ مسعود، مشمولہ: ماہنامہ شب خون، نومبر ۲۰۰۲ء، الٰہ آباد، ص ۱۹

؎۶ سوز خوانی: حرف وصوت، ڈاکٹر نیرّ مسعود، مشمولہ: ماہنامہ شب خون، نومبر ۲۰۰۲ء، الٰہ آباد، ص ۱۹

"سوزخوانی کے لیے منتخب کلام کے کچھ مجموعے بھی معمولی طور پر چھپے تھے۔ ان میں کہیں کہیں کلام کے ساتھ اس کے راگ کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ اس طرح کا ایک بہت عمدہ قلمی مجموعہ ذخیرۂ مسعود حسن ادیب میں موجود ہے۔ یہ رثائی کلام کا بھی اہم انتخاب ہے۔ ہر سوز سے پہلے اس کے لیے مقرر شدہ راگ کا نام بھی درج ہے۔ مجموعہ ناقص الطرفین ہے، اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں کل کتنے راگوں کے سوز جمع کیے گئے تھے۔ موجودہ صورت میں ان راگوں کی تعداد ۵۴ ہے۔

جن راگ راگنیوں میں سوز باندھے گئے ہیں ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔

۱۔ اساوری	۲۔ الھیا	۳۔ الھیا آمیزش دھناشری
۴۔ الھیا بہاگ مرگ	۵۔ ابیری	۶۔ ایمن
۷۔ ایمن کلیان	۸۔ باگیسری	۹۔ بھاس
۱۰۔ برزق	۱۱۔ بسنت	۱۲۔ بلاول
۱۳۔ بندرابنی	۱۴۔ بہاگ	۱۵۔ بہاگ مرگ
۱۶۔ بہاگڑا	۱۷۔ بھیرویں	۱۸۔ بھیرویں صبح
۱۹۔ بھیرویں مقام	۲۰۔ بھیم پلاسی	۲۱۔ بھیم سارنگ
۲۲۔ پٹ منجری	۲۳۔ پرج	۲۴۔ پنچم راگ
۲۵۔ توڑی	۲۶۔ جاجکی	۲۷۔ جون پوری
۲۸۔ جونپوری توڑی	۲۹۔ جھنجھوٹی	۳۰۔ جیت
۳۱۔ چھایانٹ	۳۲۔ دیس کار	۳۳۔ رام داس کی ملار
۳۴۔ رام کلی	۳۵۔ زیلف	۳۶۔ ساونی
۳۷۔ سری راگ	۳۸۔ سندھ	۳۹۔ سندھ بھیرویں
۴۰۔ سندھرا	۴۱۔ سنگھڑا	۴۲۔ سورٹھ
۴۳۔ سوہا	۴۴۔ سوہنی	۴۵۔ شدھ سارنگ
۴۶۔ کافی	۴۷۔ کالندرا	۴۸۔ کانگڑا
۴۹۔ کاموو	۵۰۔ کانھرا	۵۱۔ کدارا
۵۲۔ کلیانی	۵۳۔ کھٹ راگ	۵۴۔ کھماج

۵۵۔ کھماج بہاگ مرکب ۵۶۔ کھماج جھنجھوٹی مرکب ۵۷۔ گن کلی
۵۸۔ گوجری ۵۹۔ گوری ۶۰۔ گوڑ سارنگ
۶۱۔ گونڈ ۶۲۔ للت ۶۳۔ مالسری
۶۴۔ مالکوس ۶۵۔ مرگ کھماج جھنجھوٹی ۶۶۔ میاں کی ملار
۶۷۔ میگھ ۶۸۔ نائکی ۶۹۔ نٹ
۷۰۔ نٹ ملاری ۷۱۔ بھیر ۷۲۔ ہنڈول
۷۳۔ ہیم سارنگ

(۲)

ذیل میں راگوں کے تحت پڑھے جانے والے کچھ سوز درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ اساوری (مرثیہ راگ ساگر)

اصحاب جب امام کے بے سر ہوئے تمام
اولاد پھر عقیل کی میداں میں آئی کام
جعفر کے پوتوں نے کیا دادا کا اپنے نام
قاسم نے پھر سلاح کو زیب کمر کیا

۲۔ الھیا

جب پہنچی عزیزو یہ خبر چرخ بریں پر
بے سر ہے پڑا سبطِ نبیؑ آج زمیں پر
کوئی رونے بھی آتا نہیں لاش شہ دیں پر
یہ سن کے عجب صدمہ ہوا روح الامیں پر
رو رو کے کہا قتل ہوا جان علیؑ ہے
زہراؑ کے کلیجے پہ چھری آج چلی ہے

☆☆

اے مجرئی جب چھد گئی اصغر کی گردن تیر سے
تب مسکرا کر ہنس دیا رخصت ہوا شبیرؑ سے

☆☆

جب بے کسوں کو شام کے زنداں میں گھر ملا
بولی سکینہ یاں بھی نہ میرا پدر ملا
کیا کیا نہ رنج یاں مجھے شام و سحر ملا
بچھڑا ہوا چچا نہ مرا آن کر ملا
ہر کوچ میں، میں سختی تھی اور ہر مقام میں
بابا چچا ملیں گے تجھے ملک شام میں

۳۔الھیا آمیزش دھناشری

سونگھی ہے جس نے مرقد شاہ زمن کی بو
بھرائی اس کو پھر نہیں بھاتی چمن کی بو

۴۔الھیا بہاگ مرگ

رو سلامی سارے دن آہیں کیا کرو رات بھر
قتل کی شب کو رہے تھے شاہ مضطر رات بھر

۵۔اہیری

سکینہ خواب میں بولی سلام لو بابا
یتیم بیٹی کو جنت میں لے چلو بابا

۶۔ایمن

لکھ منقبت ولی والا
ہم نام خداؑ علی اعلیٰ
وہ نفس نبی یہ نص آیہ
قرآں میں جس کا ہے کنایہ
وہ حامی دین مصطفےٰؐ ہے
باللہ کہ وہ مظہر خدا ہے

☆☆

جب رن میں گئے زینب ناشاد کے پیارے
اور ڈوب گئے شام کے بادل میں وہ تارے
جس وقت کہ جنگاہ سے آگے کو سدھارے
ماں آئی چلی ڈیوڑھی پہ بے تابی کے مارے
پہنچی یہ خبر بنت شہنشاہ نجف کو
بیٹے گئے لڑتے ہوئے دریا کی طرف کو

☆☆

جب طبل جنگ کی ہوئی رن میں صدا بلند
شور نشور فوج عدو سے ہوا بلند
ایسا غبار رن میں ہوا تھا سوا بلند
اک تازہ آسماں تھا بروئے ہوا بلند
تیر نگاہ چرخ پہ جانے سے رہ گیا
خورشید آسماں نظر آنے سے رہ گیا

جب گرے گھوڑوں سے زینب کے پسر میداں میں
اور تڑپنے لگے ہو لوہو سے تر میداں میں
شہ نے اکبر سے کہا پیٹ کے سر میداں میں
عون و جعفر نہیں آتے ہیں نظر میداں میں
بولا وہ رخ ادھر ان کے نہیں پھرتے دیکھے
دو ستارے سے زمیں پر تو ہیں گرتے دیکھے

۷۔ایمن کلیان

اے رازدار احمدؐ مختار السلام
وے یادگار حیدر کرار السلام

۸۔ باگیسری

کیا کروں شادی قاسم کا میں احوال رقم
واسطے دیکھنے کے آرسی مصحف جس دم
بیاہ کی رات رکھا تخت پہ نوشہ نے قدم
گائے تقدیر و قضا یہ بدھاوے باہم
قاسما مرگ جوانانہ مبارک باشد
جلوۂ شمع بہ پروانہ مبارک باشد

۹۔ بہاس

اے چرخ غافلی کہ چہ بیداد کردہ ای
وزکیں چہادریں ستم آباد کردہ ای
کام یزید دادہ ای از کشتن حسین
بنگر کرا بہ قتل کہ دل شاد کردہ ای
ترسیم ترا دے کہ بہ محشر در آورند
کر آتش تو دودہ ز [؟] در آورند

☆☆

جب اکبر مظلوم کا گھوڑا ہو روانہ
جا رن منے اسوار کے لاشے کو پچھانا
تب سر کو پٹک بولا یہ شبیرؑ کے نانا
ٹک اپنے نواسے کا جگر آ کے بچانا

۱۰۔ برزق

کیا مجرئی عابد پر دکھ چرخ نے ڈالے ہیں
کانٹوں پہ تو چلنا ہے اور پاؤں میں چھالے ہیں

☆☆

ماں اصغر کی کہتی ہے رو رو، بچے کے سو جانے کو
تھپک تھپک سب دیں ہیں لوری، یں دیکھوں چونکانے کو

☆☆

قید خانے میں سکینہ کو جو لائی تقدیر
رو رو کہنے لگی ہے ہے مرے بابا شبیرؑ
کیوں نہیں لیتے خبر آج ہوئی ہوں میں اسیر
آؤ اب میری تمہاری ہے ملاقات اخیر
نصف شب تک بھی یہاں جینا ہے دشوار مرا
دیکھ لو آن کے یہ آخری دیدار مرا

۱۱۔ بسنت

نبی کے باغ میں کس دھوم سے ہے آئی بہار
ہزار دستۂ تسلیم ساتھ لائی بہار

۱۲۔ بلاول

دیکھ کر صبح کو میں مضطرب الحال نسیم
پوچھا کیوں ڈھونڈھتی ہے آج یہ تو ہفت اقلیم
بولی مسلم کے سنے ہوں گے وہ دو تھے جو یتیم
ایک کا نام محمد ہے دوم ابراہیم

۱۳۔ بندرابنی

جس وقت لگا اکبر ذی شان ٹھکانے
بجز آئی نہ تھے بانو کے اوسان ٹھکانے

☆☆

انصاف کسی نے نہ کیا ظلم ہوا ہے
ظالم نے محمدؐ کا جگر قتل کیا ہے
دل حیدرؑ کرار کا اس غم سے کٹا ہے
سر حضرت زہراؑ کا مصیبت میں کھلا ہے

۱۴۔ بہاگ

بہ مقتل دیکھ زینب شہ کا تن چاک
تجھی مجرے کو کر کے پیرہن چاک

۱۵۔ بہاگ مرگ

(ورق غائب ہے)

۱۶۔ بہاگڑا

اے مجرئی رو رو کے یہ فرماتی ہے بانو
اکبر علی کی لاش پہ اب جاتی ہے بانو

☆☆

مقتل پہ آ سکینہ پکاری سلام لو
اے بابا میں ہوں بیٹی تمہاری سلام لو

۱۷۔ بھیرویں (مرثیہ راگ ساگر)

اے چرخ حیف تو نے ستم اس قدر کیا
جنت میں روح فاطمہ کو نوحہ گر کیا
سردار دوجہاں کا جدا تن سر سے کیا
زہرا کی بہو بیٹیوں کو در بہ در کیا

☆☆

جب ہوا دست جفا خنجر میں سامان سحر
یک بیک ہونے لگا چاک گریبان سحر
تر لگے کرنے ملک اشکوں سے دامان سحر
سر طوبیٰ پہ گیا نالۂ مرغان سحر
غیب سے آئی ندا صبح شہادت آئی
عرش سے آتی تھی آواز قیامت آئی

☆☆

وقت سجدے کا جو اے بجرائی آجاتا تھا
سر شہ نیزے پہ قبلے کو جھکا جاتا تھا

☆☆

زنداں کی طرف ہند جو پچھلے پہر آئی
حیراں ہوئے درباں زن حاکم کدھر آئی
وہ بولی میں بے وجہ نہیں ننگے سر آئی
سر ننگے مجھے خواب میں زہرا نظر آئی
آتی ہے صدا کان میں خالق کے ولی کی
اللہ کرے خیر حسین ابن علی کی
کربلا میں جو شہ دین کے خیام آ پہنچے
اور حرم شاہ کے خیموں میں تمام آ پہنچے
پڑ گیا غل کہ مدینے سے امام آ پہنچے
شہدا اپنی شہادت کے مقام آ پہنچے
چہرے کٹ جائیں گے سب تیغوں سے جلادوں کی
کل قضا دیکھے گی فہرست نبی زادوں کی

۱۸۔ بھیرویں صبح

رخصت کو علی اکبر جب ماں کے قریں آیا
مرنے پہ کمر کس کر وہ ماہ جبیں آیا
بانو کو نظر جس دم فرزند حزیں آیا
یہ سینہ و سر پیٹا غش اس کو وہیں آیا
رو رو کے کہا پیارے کیا جی میں یہ آئی ہے
اب اپنی سواری کیوں ڈیوڑھی پہ منگائی ہے

۱۹۔بھیرویں مقام

گذر منزل تسلیم و رضا مشکل ہے
سہل ہے عشق بشر عشق خدا مشکل ہے
وعدہ آسان ہے وعدے کی وفا مشکل ہے
جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے
یہ فقط ختم ہوا فاطمہ کے جانی سے
مشکلیں جتنی ہوئیں کاٹیں وہ آسانی سے

☆☆

جب کوفیوں نے مل کے کہا کیا مضائقہ
دنیا ملے گی دیں نہ ملا کیا مضائقہ
شہ نے کہا کہ حق ہے بھلا کیا مضائقہ
گر اس میں سر بچا نہ بچا کیا مضائقہ

۲۰۔بھیم پلاسی

لاڈلی سکینہ پوچھت ہیں بار بار بابل بیر مورے اب کونوں گھر آئیں گے
نکست ہیں پران ہوک اٹھت ہیں کرہیجے مادھکت ہے چھاتی سوہ مونا ہوئیں دکھائیں گے
ہوں تو ہتھیاری سی جیا کی پھوہاری سی بیٹھی ہوں نراس آس تاکڑی ٹھاؤں گی
جانی ہم بیتے دن بہت جی نہ آئے ڈگ [کذا] کربل میں شہید علی اکبر ہو جائیں گے

☆☆

زبس عرش بریں پر ہے شہ دلگیر کی جاگہ
تو جنت کیوں نہ ہو مجرائی شبیر کی جاگہ

۲۱۔بھیم سارنگ

(اوراق غائب)

۲۲۔ پٹ منجری

ہے سلام اس پہ حرم جس کے گرفتار پھرے
جنس غم ساتھ لیے بر سر بازار پھرے
[نیز دیکھیے کا سود]

۲۳۔ پرج

اے مجرئی قاسم بنا جس دم گیا مارا
عباس نے کاندھے سے علم اپنے اتارا
آکر درخیمہ پہ یہ زینب کو پکارا
مجرے کے لیے آیا ہے یہ بھائی تمہارا

☆☆

جب لگا تیر ستم شاہ کی پیشانی پر
دھاریں لوہو کی بہیں چہرۂ نورانی پر
تھا عجب وقت پڑا فاطمہ کے جانی پر
دسترس مالک کوثر کو نہ تھا پانی پر
دیکھتا تھا کبھو خیمے کو کبھو دریا کو
سامنا لاکھوں ستم گاروں سے تھا تنہا کو

☆☆

عباس نے جب کوچ کیا ملک عدم کو
بھائی کا نہایت ہوا غم شاہ امم کو
آنکھوں سے لگاتے تھے یہ کہہ مشک و علم کو
عباس علی داغ بڑا دے گئے ہم کو
خوں اشکوں کی جا آئے نہ کیوں دیدۂ تر میں
اس داغ سے واللہ پڑا زخم جگر میں

۴۴۔ پنچم راگ

چمن میں آئی ہے کیسی یہ رت مرے نین سے کوئی نہارے
ہوا کی چھاتی پہ بال ہر مرغ کھینچتا ہے الم کے آرے

۴۵۔ توڑی

حسینی قافلہ جب کربلا کے دشت میں آیا
ستم گاروں کے ہاتھوں سے نہایت رنج ودکھ پایا
نہ پانی پینے پائے اور نہ دانہ تین دن پایا
حسین ابن علی نے تب یہ ہو لاچار فرمایا
تمہیں اس مخمصے میں دانہ اور پانی خدا دیوے
خبر نانا محمدؐ لیوے یا مشکل کشا لیوے

۴۶۔ جاجکی

اے سلامی وطن شاہ تو کچھ دور نہ تھا
ایک شبیر کو پھر جانا ہی منظور نہ تھا

☆☆

سلام اس پر جو ہے محبوب حق کا ماہ کنعانی
کہ جس کے نور حق سے مہر و مہ دونوں ہیں نورانی

۴۷۔ جون پوری (مرثیہ راگ ساگر)

حجت کے بعد آئی جو تلوار درمیاں
لڑنے لگے امام کے لشکر کے سب جواں
جس کو امام جن وبشر نے کہا کہ ہاں
اس نے گروہ شام کو زیر وزبر کیا

☆☆

اس پہ سلام جس نے بلا اختیار کی
چھوڑی وہ راہ راہ رضا اختیار کی

۲۸۔ جون پوری توڑی

اے سلامی بخت اگر اپنے رسا ہو جائیں گے
راہی ہم اک روز سوئے کربلا ہو جائیں گے

۲۹۔ جھنجھوٹی

کون سے ظلم کا سجاد پہ طغیاں نہ ہوا
تو بھی اے مجرئی ذرہ وہ ہراساں نہ ہوا

☆☆

اس کو یہ مجرا یہ کبھی جس کی تمنا نہ گئی
ساتھ سب بابا کے گھر سے گئے صغرا نہ گئی

☆☆

وہ جو کہتے ہیں کیا دوپہر تھی صبح شہادت کی
سو کیوں کس کہتے وہ دوپہر تھی روز قیامت کی
حسینی فوج کی خاطر کھلی تھی راہ جنت کی
یزیدی قوم سرگرداں ماری ہوئی تھی لعنت کی

۳۰۔ جیت

کیا مشت خاک جا کے مقابل ہو نور سے
جس جا کہ جبرئیل کا مجرا ہو دور سے

۳۱۔ چھایانٹ

اے سلام جو گھونگٹ میں بیٹھی روتی ہے
اس اجڑے سہرے میں موتی سے کچھ پروتی ہے

۳۲۔ دیس کار (مرثیہ راگ ساگر)

پہنچا حریم کعبہ میں جس دم وہ تاج دار
خط کوفیوں کے شاہ کو پہنچے کئی ہزار
رہنے دیا نہ شاہ کو کعبے میں زینہار
گھر میں خدا کے ظالموں نے شور و شر کیا

۳۳۔رام داس کی ملہار

نکلی ہے آہ بھرائی اشکوں کا کر کے ساتھ
جھونکے ہوا کے چلتے ہیں جوں ابر تر کے ساتھ

۳۴۔رام کلی (مرثیہ، راگ ساگر)

پہنچی یہ فرق فاتح خیبر کو جب شکست
دین نبی کا اٹھ گیا دنیا سے بندوبست
بولے حسن حسین یہ مل کے اپنے دست
تقدیر نے جہاں میں ہمیں بے پدر کیا

۳۵۔زیلف

ہے سلام اس پہ جو ہے سرو خرامان گلستان شہنشاہ نجف رونق بستان محمد
ماہتاب فلک لطف وکرم زیب وہ مسند تسلیم و رضا مہر درخشان محمد

۳۶۔ساونی

امام رہبر خدا کے مظہر علی کے دلبر سلام لینا
قسیم کوثر شفیع محشر غریب پرور سلام لینا

۳۷۔سری راگ

اے کمر بستہ بہ خوں ریزی اولاد رسولؑ
ہیچ (...؟) زخداوند جہاں شرم نہ بود
ہیچ اندیشہ نہ کردی کہ رسول الثقلین
در پئے حرمت ایشان چہ وصیت فرمود

☆☆

ترسم جز اے قاتل اوچوں رقم زنند
یک بارہ بر جریدۂ رحمت قلم زنند

۳۸۔سندھ

جب اصغر کو اماں نے غربت دکھائی
کوئی دودھ کی بوند مطلق نہ پائی

تب اصغر کی آنکھوں میں اک نیند آئی
شلوکے اپر اس نے گردن جھکائی

☆☆

جب خالی گھوڑا خیمے میں آیا امام کا
ماتھا لہو سے سرخ تھااس خوش خرام کا
غل کررہاتھاغول وہ سب فوج شام کا
سرکٹ گیا حسین علیہ السلام کا
زینب کی چھاتی دیکھ کے گھوڑے کو پھٹ گئی
اگلے سموں سے آکے سکینہ لپٹ گئی

۳۹۔سندت بھیرویں

جب کہ شبیر کی ڈیوڑھی پہ سواری آئی
پیٹتی روتی ہوئی شاہ کی پیاری آئی
بولی میں چھاتی سے لگنے کوتمہاری آئی
سب تومارے گئے کیاآپ کی باری آئی
تم اگر جاتے ہو رن کومرے پیارے بابا
ہم کوبھی لیتے چلوساتھ ہمارے بابا

☆☆

جب ہوا لشکر اسلام صف آرا رن میں
اور نقیبوں نے جوانوں کو پکارا رن میں
ہوچکا جنگ کاسامان جو سارا رن میں
کیا حضرت نے رفیقوں کو اشارہ رن میں
یعنی مت دیر کرے سر جسے کٹوانا ہو
جائے دنیاسے وہ جنت میں جسے جاناہ و

۴۰۔ سندھرا

فی الحقیقت نطق اے یارو یہاں بے کار ہے
دل سلام شاہ کہتا ہے، زباں بے کار ہے

۴۱۔ سنگھوا

جب سے میں نے دیکھا ہے گردوں پہ محرم کا ہلال
روز و شب مجھ کو رہا کرتا ہے رونے سے خیال
کہہ نہیں سکتا کسو سے آہ اپنے دل کا حال
ابر گردوں بار گر دیکھو تو ہے میرا رومال

☆☆

ہے سلام اس پر جو کہتی تھی کہ بھائی دیکھیے
بھانجے لڑتے ہیں، دونوں کی لڑائی دیکھیے

۴۲۔ سورٹھ

تسلیم اسے جس کو غم بے پدری ہے
اور تشنہ لبوں کے لیے چشموں میں تری ہے

☆☆

مجرا اسے جو حلق پہ کھا تیر رہ گیا
اس وقت آہ کھینچ کے شبیر رہ گیا

۴۳۔ سوہا

سلامی کیونکے وطن وہ شہ زماں پھر جائے
جو ملک غیر میں اس شہ سے اک جہاں پھر جائے

۴۴۔ سوہنی

قید ہو لاش پہ بھائی کی جو زینب آئی
بولی مجرا لو مرا اے مرے بے سر بھائی

۴۵۔شدھ سارنگ [''سدھ سالہنگ'']

روتے ہیں آل مصطفٰے ہائے حسین کیا ہوا
شاہ شہید کربلا ہائے حسین کیا ہوا
نور دو عین مرتضٰی ہائے حسین کیا ہوا
مظہر نور کبریا ہائے حسین کیا ہوا

۴۶۔کافی

نہ بجری کی ہو گردن میں کیوں بھلا زنجیر
جو عابدیں کے رہے ظلم کی بہ پا زنجیر

☆☆

سلام اس پر جو کہتا تھا گرفتاری ہے اور میں ہوں
تپ ہجر پدر کی دل کو بیماری ہے اور میں ہوں

☆☆

خیال طرز سخن کو جو دل میں لاؤں میں
اور اپنی طبع کا کچھ زور آزماؤں میں
تو پھر سلام بھی ایسا ہی کہہ سناؤں میں
بہت سا جس کا صلہ روز حشر پاؤں میں

۴۷۔کالندرا

سلام اس پر جو کہتا تھا توانائی کی یہ صورت
قدم اٹھتے نہیں اور دشت پیمائی کی یہ صورت

☆☆

اس کو مجرا جو دم قتل ہراساں نہ ہوا
دیکھ کر آئینہ خنجر کا بھی حیراں نہ ہوا

۴۸۔کانگڑا

پہنچے شبیر کے جب اہل حرم کوفے میں
ہوئی اک خلق تماشے کو بہم کوفے میں

کہا زینب نے یہ بادیدۂ نم کوفے میں
آج جاتے ہیں عجب شکل سے ہم کوفے میں
اک دن آئے تھے یہاں اپنے پدر کے ہمراہ
یا تو آج آئے ہیں شبیر کے سر کے ہمراہ

☆☆

جب دختران فاطمہ و شیر کردگار
ہمشیر ہائے شبر و شبیر نام دار
ہو کر اسیر فوج ستم گر قضائے کار
برناقۂ برہنہ جو ہونے لگیں سوار
رن کو اٹھا کے ہاتھ یہ بولیں بہ شور و شین
بے پردہ آج ہم ہوئے فریاد یا حسین

۴۹۔ کاموو

ہے سلام اس پہ حرم جس کے گرفتار پھرے
جنس غم ساتھ لیے بر سر بازار پھرے

[نیز دیکھیے پٹ منجری]

۵۰۔ کانھرا

عابدیں کہتے ہیں اے پروردگار
ایک بھائی کو بھی رکھتا روزگار
یک دگر اس وقت ہوکر غم گسار
روتے آپس میں گلے مل زار زار

☆☆

نئی یہ شادی بیاہ کی کس کے تو نے فلک رچائی ہے
کس دکھیاری کا ہے جایا کس سکھیا کی جائی ہے
سر چھاتی نقارے ہیں فریاد و فغاں شہنائی ہے
سوز جگر ہے آتش بازی ہر اک آہ ہوائی ہے

۵۱۔ کدارا

بحرائی کہتی تھی زینب غم کی ماری یاد ہے
ذبح ہونا بھائی کا بھاوج کی زاری یاد ہے

۵۲۔ کلیان

ہوئے جب قتل سب بحرائی رن میں برچھیاں کھا کے
پرے خالی ہوئے چاروں طرف سے شاہ تنہا کے
گئے جنت کو سب خدام اس درگاہ والا کے
حرم کا شور تھا اور خیمے اردوئے معلی کے

☆☆

صبا درود تو اس شہ کے لال کو پہنچا
جمال جس کا نبی کے جمال کو پہنچا

۵۳۔ کھٹ راگ (مرثیہ راگ ساگر)

منظور تھی امام کو جو مرضی الہٰ
کعبے سے تب عراق کی جانب چلا وہ شاہ
دی آن کر خبر یہ کسی نے میان راہ
اعدا نے قتل آپ کا پیغام بر کیا

۵۴۔ کھماج

موا اے بحرئی نوشاہ جو بن کے ٹکڑے
اس کی دلہن نے کیے سوہے برن کے ٹکڑے

☆☆

قاسم نے جو دلہن کو بادیدۂ تر دیکھا
اور اشکوں کو چہرے پہ جوں سلک گہر دیکھا
بیہوڑا ہوا زانو پہ دلہن کا جو سر دیکھا
کہنے لگا اے صاحب تم نے نہ ادھر دیکھا

عمو کی مصیبت پہ جلتا ہے جگر میرا
میں رات کا مہماں ہوں، ہے کوچ سحر میرا

☆☆

جناب زینب نے قید خانے سے شام کے جب نجات پائی
اور اس غریب الوطن کو قسمت دوبارہ پھر کربلا میں لائی
یکایک اس کو وہ دشت غم خیز کربلا کا دیا دکھائی
جہاں پڑا تھا زمیں پر اس کا حسین سا غم گسار بھائی
پکاری رورو کے اب میں یہاں سے وطن کی ہرگز نہ راہ لوں گی
یہیں رہوں گی یہیں بسوں گی یہیں جیوں گی یہیں مروں گی

☆☆

مہندی کی آج قاسم نوشہ کی دھوم ہے
خیمے میں اہل بیت نبی کے ہجوم ہے
ماں اس بنے کی کہتی یہ منہ چوم چوم ہے
زانو پہ سر جھکاؤ نہ یہ کیا رسوم ہے
اے لال ساس دیکھتی ہوگی قنات سے
مہندی لگاؤ چھوٹی سی سالی کے ہاتھ سے

۵۵۔کھماج بہاگ مرکب

لاشِ شہ بولی جدا ہے میرا پہنچا ہاتھ سے
کیونکر اے اماں کروں میں تم کو مجرا ہاتھ سے

۵۶۔کھماج جھنجھوٹی مرکب

جھولے میں اصغر علی پیاس سے جب مر چلا
بانو لگی پیٹنے ہائے یہ دلبر چلا
جا چکا اکبر علی اب مرا اصغر چلا
ہیو دیکھو ذرا مجھ سے یہ کیا کر چلا

دیر سے آواز بھی یہ مجھے دیتا نہیں
اب تو گلا مل گیا سانس بھی لیتا نہیں

۵۷۔ کن کلی

اس کو مجرا جس کو یوں کہتے ہیں سب اہل یقیں
السلام اے سایہ ات خورشید رب العالمیں

۵۸۔ گوجری

مضمون سلام اس کے لکھتا ہے قلم تازہ
جس کا کہ ہے محشر تک ہر سال میں غم تازہ

☆☆

تازی شہ مظلوم کا جب رن سے گھر آیا
تب جانا سکینہ نے کہ شاید پدر آیا
جا دیکھے تو لوہو بھرا گھوڑا نظر آیا
دوڑی کہ اماں بابا موا، اب قہر آیا

☆☆

بچی شہ کی جب روئی پانی بغیر
کہ ہم مر چلے زندگانی بغیر
کوئی بوند پانی پلاتا نہیں
اے بابا تری مہربانی بغیر

۵۹۔ گوری

آئی سنائی شاہ کی جس دم مدینے میں
صغرا پکاری خاک مرے ایسے جینے میں
کیوں آتش الم نہ لگے میرے سینے میں
ہائے یتیم ہوگئی میں اس مہینے میں

فرقت کا داغ دل پہ بھی میرے دھر گئے
صغرا کے تھے جو چاہنے والے وہ مر گئے
کیوں مثل آسیانہ فلک نوحہ گر پھرے
خورشید سر برہنہ نہ کیوں چرخ پر پھرے
کیوں جا بجا سحاب نہ با چشم تر پھرے
نیزے پر سر حسینؑ کا جب در بہ در پھرے
کیوں داغ دار غم سے نہ سینہ ہو ماہ کا
ٹکڑے ہوا ہے چاند رسالت پناہ کا

☆☆

بجرئی تازہ ہوا پھر شہ کو غم عباس کا
دوش پر اکبر نے جب رکھا علم عباس کا
جان دیتی تھی سکینہ نام پر عباس کے
نام لے سکتے نہ تھے اہل حرم عباس کا

۶۰۔ گوڑ سارنگ

کیوں مضطرب الحال نسیم سحری ہے
ہر دل کو طرح لالے کے داغ جگری ہے
بلبل کو ترانے کے بدل نوحہ گری ہے
اس باغ سے کیا آل محمد سفری ہے

۶۱۔ گونڈ

اے مدینے کے ستارے السلام
کربلا کے گھر اتارے السلام

۶۲۔ للت (مرثیہ، راگ ساگر)

جب ہوگیا شہید پیمبر کا ابن عم
پھر شاہزادوں کو نہ ملا چین ایک دم

اہل ستم کے ہائے بیان کیا کروں ستم
زہر دغا سے ٹکڑے حسن کا جگر کیا

۶۳۔ مالسری

بحرئی جو شہ کے ہیں افلاک کے سائے تلے
وہ ہی آسودہ رہیں گے خاک کے سائے تلے

۶۴۔ مالکوس

اے باد صبا آج وہ سلطان کہاں ہے
وہ بنت نبی فاطمہ کی جان کہاں ہے

۶۵۔ مرگ کھماج جھنجھوٹی

جس دم شب اخیر سکینہ ستم زدی
زانو سے ماں کے آنکھوں کو ملتی ہوئی اٹھی
جاگی تو زلفیں نوچ کے وہ کہنے یوں لگی
کوئی مجھ کو عین خواب میں کہتا تھا اس گھڑی
کیا تو نے ماں کے زانو پہ گردن جھکائی ہے
تیرے پدر سے پانی کی خاطر لڑائی ہے

۶۶۔ میاں کی ملار

ہمارے ہاتھ گر مجرے کی شہ کے بار لگ جاوے
یقیں ہے دو جہاں میں اپنا بیڑا پار لگ جاوے

۶۷۔ میگھ

سنو محبان نس دن جگ میں خون نین سے جاری ہے
جس کو دیکھو شہ کے غم کا داغ جگر پر کاری ہے

۶۸۔ تا یکی

اخی کی لاش پر زینب پکاری جا کے رو رو کر لٹا کر اپنا سب گھر در بہن مجرے کو آئی بے سروسامان
اے بھائی پڑی طرفین یہ آفت مرے سر پر نہیں چادر ترے تن پر نہیں ہے سر تری مظلومی کے اوپر بہن قربان اے بھائی

۶۹۔ نٹ

کس دن اس شادی نے پایا تھا قرار
ہووے اس شادی کا یہ انجام کار
رات جلوے کی دلہن یوں سوگوار
روتی ہے گھونگٹ میں چھپکی زار زار

۷۰۔ نٹ ملاری

کہو اس پہ سلام و درود سدا کہ جو مطلع صبح سعید ہوا
اسے شام کی فوج نے گھیر لیا مع اہل و عیال شہید ہوا

☆☆

رواں کن اے سلامی سیل اشک چشم گریاں را
کہ تا شوید غبار مرقد شاہ شہیداں را

۷۱۔ بھیر

سلام مقبول جس بشر کا نبی علی کی جناب میں ہے
حساب عصیاں سے اپنے فارغ وہ شخص اور حساب میں ہے

۷۲۔ ہنڈول

جب قضا آئی ہے شہ کو لے کے ماتم کی بہار
زخم کاری شہ کے تن پر کھل رہے ہیں گل انار
خوں سے کیاری کھل رہی ہے درمیان کارزار
آج کھیلن پھاگ تھا وہ علی کا یادگار

۷۳۔ بھیم سارنگ

جس سلامی کو حسین اپنے کا غم یاد رہے
اور رونے کے سوا کچھ اسے کم یاد رہے

(۳)

یہ نامکمل مجموعہ بھی سوزخوانی پر کلاسیکی موسیقی کے تسلط کا اندازہ کرانے کے لیے کافی ہے۔ یہ

تسلط یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ سوز کے تعارف اور تعریف میں بھی موسیقی کی اصطلاحیں استعمال ہونے لگی تھیں۔ بعض اہل فن سوز پڑھنے سے پہلے سامعین کو یہ بھی بتاتے تھے کہ اس کی بندش کس راگ میں ہے۔[۷] اسرار حسین خان بتاتے ہیں کہ واجد علی شاہ کے یہاں کی مجلسوں میں مہدی خان جب سوز پڑھتے تھے تو رکھب، پنچم اور نکھاد کے تینوں سر اس خوبی سے لگتے تھے کہ خود ظل سبحانی بے چین ہو کر بے ساختہ پکار اٹھتے تھے کہ کیا رکھب لگی ہے! انیس الدولہ کہہ اٹھتے تھے کہ واہ ری پنچم! اور اسی طرح کوئی حضرت بار بار نکھاد کے سُر پر پھڑک جاتے تھے۔ پرچ کے بعد بہاگ کا سوز، بہاگ کے بعد جنگلا، پھر کافی، پھر ایمن کلیان وغیرہ۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر سوز میں آ کر راگنی نے جنم لیا ہے۔ گلا ہے کہ ارگن کی طرح سُر دے رہا ہے۔[۸]

اس تسلط کا ایک سبب یہ تھا کہ سوز خوانی کی تربیت اور مشق کے لیے گلے کی تیاری، سر کی درستی اور اس غرض سے فن موسیقی کی کچھ نہ کچھ تعلیم ضروری تھی۔ بعض علما فن موسیقی کو شرعاً جائز نہیں سمجھتے تھے۔ شریعت غنا کو بعض شرطوں اور پابندیوں کے ساتھ قبول کر سکتی ہے (مثلاً تان پلٹے، مُرکیاں وغیرہ ممنوعات میں ہیں)۔ اس لیے متشرع لوگ سوز خوانی بھی نہیں سنتے تھے"[۹]

ڈاکٹر سید سکندر آغا نے اپنی کتاب "سوز خوانی: تاریخ و تذکرہ" میں لکھا ہے کہ:

"ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک صاحب نے ایک مجلس منعقد کی، مولوی محمد ہاشم بھی شرکت کے لیے آئے۔ سوز خوانی کے لیے جیسے ہی محسن صاحب بیٹھے مولانا نے مجلس سے اٹھ جانے کا قصد کیا۔ محسن صاحب نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ حضور کو امام مظلوم کا واسطہ، مجلس سے اٹھ کر نہ جائیں۔ خلاف شرع اگر کچھ نکلے تو جو سزا تجویز کی جائے، حاضر ہوں اور سوز پڑھنا شروع کیا۔ رقت کا یہ عالم تھا کہ اہل مجلس کی آنکھوں سے آنسو طوفان نوح کی طرح بہہ کر نکل رہے تھے، سلام کے بعد مرثیہ

لاش اکبر کی جو مقتل سے اٹھا لائے حسین

پڑھا گیا مجلس میں کہرام بپا ہوا، خود مولانا کا گریہ کرتے کرتے عجب حال ہو گیا۔ رومال اشکوں سے تر ہوا، مجلس ان کو ہی پڑھنی تھی جب ان سے کہا گیا کہ تو انھوں نے کہا کہ مجلس تو ہو گئی

---

۷ سوز خوانی حرف و صوت، ڈاکٹر نیر مسعود، مطبوعہ ماہنامہ شب خون، الہ آباد، نومبر ۲۰۰۲ء، ص: ۲۸

۸ قدیم ہنر و ہنرمندان اودھ، سید اسرار حسین خان، ۱۹۳۶ء، لکھنؤ، ص: ۸۶

۹ سوز خوانی حرف و صوت، ڈاکٹر نیر مسعود، مطبوعہ ماہنامہ شب خون، الہ آباد، نومبر ۲۰۰۲ء، ص: ۲۸

اب مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ مجلس پڑھ سکوں''۔۱۰

پرانے سوز شرعی حدود کے اندر بنائے جاتے تھے۔ ان کی دھنیں نسبتاً سیدھی سادی لیکن پر اثر ہوتی تھیں۔ ان دھنوں کا تیار کرنا آسان کام نہیں تھا اور میر علی کے پائے کے استادوں ہی سے بن آتا تھا۔ ان استادوں کے سوز قیمتی سرمایہ سمجھے جاتے اور سینہ بہ سینہ محفوظ رکھے جاتے تھے۔ قدردان ان کے مستند سوزوں کی تلاش میں رہتے تھے''۔۱۱

سوزخوانی کے شرعی جواز کے بارے میں سید آغا مہدی نے اپنے مضمون ''میر علی سوزخوانی اور سوزخوانی تاریخی روشنی میں'' میں چند فتوؤں کا ذکر بھی کیا ہے۔

''آج سے نصف صدی پہلے مجتہدین کی شیعیت پر روحانی حکومت تھی۔ اس وقت کے جرائد اور رسالوں میں صرف رسالہ العوارف تھا جو مذہبی ترجمان اور بلا کسی سالانہ چندہ کے نشر ہوتا تھا۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے اسی رسالہ میں سرکار ناصر الملت کا ایک جواب شائع ہوا جو درحقیقت مستفتی کے جواب پر مجبور کرنے کی وجہ سے تھا۔

السوال ما قولکم دام ظلکم العالی علی رؤس الموالی بعض حضرات مشہور کرتے ہیں کہ حضور بعض مخصوص سوزخوانوں کی سوزخوانی کو سماعت فرماتے ہیں اور بعض کو اجازت تحریری یا زبانی سوزخوانی کے متعلق عطا فرمائی ہے۔ دریافت طلب یہ امر ہے آیا حضور سوزخوانی کی مجالس میں عموماً یا خصوصاً شریک ہوتے ہیں یا نہیں اور حضور نے سوزخوانوں میں سے کسی فرد واحد کو بھی اجازت زبانی یا تحریری عطا فرمائی ہے یا نہیں

بینوا و توجروا

الجواب

میں کسی سوزخوان کی سوزخوانی کو نہیں سنتا ہوں اور میں نے کسی سوزخوان کو کبھی اجازت زبانی یا تحریری سوزخوانی کے متعلق نہیں دی واللہ العالم

ناصر حسین عفی عنہ بقلمہ

العوارف ماہ جمادی الاولی ۱۳۲۹ھ

---

۱۰ سوزخوانی تاریخ و تذکرہ، ڈاکٹر سید سکندر آغا، لکھنؤ، ص: ۶۷

۱۱ سوزخوانی حرف و صوت، ڈاکٹر نیر مسعود، مطبوعہ ماہنامہ شب خون الہ آباد نومبر ۲۰۰۲، ص: ۴۸

ایک دوسرا مسئلہ اسی جریدہ میں اس سے پہلے بایں الفاظ شائع ہوا تھا...... کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ امام باڑہ میں سب سے زیادہ ضرورت حدیث خوان کی ہے یا مرثیہ خوان وسوزخوان کی اور مذہب امامیہ کے نزدیک کس کا مرتبہ زیادہ ہے

الجواب

ایسے حدیث خوان کی جو روایات کتب معتبرہ سے بیان کرے زیادہ ضرورت ہے اور اس کا مرتبہ زیادہ ہے اور یہ امر اس حالت میں ہے کہ مرثیہ خوان اشعار مشتمل بر کذب نہ پڑھتا ہو اور سوز خوان مرثیہ میں غنا نہ کرتا ہو۔ ورنہ مقرر کرنا ان کا ناجائز ہوگا۔

ناصر حسین عفی عنہ بقلمہ

(از العوارف بابت محرم ۱۳۲۷ھ ص: ۳)

اس مسئلہ کی زد میں صرف وہی طبقہ آتا تھا جو غنا کرتا تھا اس وقت بھی بغیر غنا کے پڑھنے والے تھے اور اب بھی ہیں"۔[۱۲]

[۱۲] "میر علی سوزخواں اور سوزخوانی تاریخی روشنی میں"، سید آغا مہدی، مشمولہ ہفت روزہ ارشاد، کراچی، ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۱ء تا ۳ نومبر ۱۹۶۱ء

چھٹا باب

سوزخوانی کے مقبول ترین شعرا
دلگیر، انیس اور دبیر

سوزخوانی میں کلام کا انتخاب بہت اہمیت کا حامل ہے۔ تمام سوز خوان مختلف مواقع پر پڑھنے کے لیے اپنا مخصوص و منفرد کلام مرتب کرتے ہیں جسے اس سوز خواں کا بستہ کہا جاتا ہے۔ نئے سوز خوانوں کی رہنمائی اور سہولت کے لیے ایسے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ۲۸ رجب ۶۰ھ کو مدینہ منورہ سے امام حسین اور ان کے متعلقین کی روانگی سے اس لٹے پٹے قافلہ کی مدینہ واپسی تک کے منظوم واقعات کو محفوظ کیا گیا ہے۔ ان مجموعوں میں جناب نسیم امروہوی کا ''چشمہ غم''، سید حسین عباس زیدی کا دو جلدوں پر مشتمل ''سوز کربلا''، قیصر مشہدی کے ''تنویر غم''، ''نوائے غم''، ''عرفان غم'' اور ''سوز غم''، سید ظہور حیدر رضوی جارچوی کا ''شعور سوز و مرثیہ''، سبط جعفر زیدی کا ''بستہ''، محمد حسین نگر بھکری کا دو حصوں پر مشتمل ''شمشیر غم'' اور ماجد رضا عابدی کا ''کرب کربلا'' سرفہرست ہیں۔

سبط جعفر زیدی نے لکھا ہے کہ:

''سوزخوانی میں ہمیشہ مستند و معیاری کلام پڑھا جاتا ہے اور ضعیف عامیانہ یا مناظرانہ انداز سے پرہیز برتا جاتا ہے، انتخاب کلام اور بندش کی ترتیب میں بڑی احتیاط اور اہتمام سے کام لیا جاتا ہے۔ جدید مرثیہ اور مسدس میں رثا اور پُرسہ کم ہوتا ہے اور فکر و فلسفہ زیادہ اس لیے بالعموم جدید شعرا کی بجائے قدیم اساتذہ کے کلام کو ترجیح دی جاتی ہے تاہم بعض جدید شعرا نے بھی سوزخوانی اور سوزخوانوں کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے شہادت بین اور پُرسہ پر مبنی کلام

بھی کہا ہے جو سوز خوانی میں پڑھا جاتا ہے۔"[1]

سوز خوانی کے ابتدا سے ہی جن مرثیہ گو شعرا کا کلام مقبول عام رہا ہے ان میں دلگیر، انیس اور دبیر کے نام سرفہرست ہیں۔

ڈاکٹر اسد اریب نے اپنے مضمون سوز خوانی تاریخ و تہذیب میں لکھا ہے کہ:

"سوز خوانی کا بڑا سرمایہ، دلگیر لکھنوی کے مرثیوں سے ہمارے ہاتھ آیا۔ دلگیر نے اپنے مرثیوں میں زبان کے کمالات اور علم بیان کے معجزات دکھانے کی بجائے، حسرت و حرماں، حزن و ملال کے موضوعات کا انتخاب کیا، مدینے سے قافلہ حسینی کی روانگی کے وقت، بی بی صغرا کے حسرت آمیز مکالمے، سقائے حرم کی فرات کی طرف رخصت کے احوال میں۔ جناب سکینہ کا محزون و مغموم ہونا، قتل گاہ کی طرف جناب علی اکبر کا رخصت کرنا، علی اصغر کی شہادت، ڈوبتے سورج کے وقت شام غریباں کا منظر، یہ سب دل دوز منظر دلگیر نے اپنے مرثیوں میں ایسے دل سوز قرینے سے لکھے کہ سوز خواں اپنی خواندگی کے لیے یہیں سے شعروں کا انتخاب کرتے۔

ہمیں نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع شدہ میاں دلگیر کے ایک نسخے کی عبارت بھی یہی جتلاتی ہے۔

مدار کل خواندگان مرثیہ و شائقان گریہ بہ احوال آل عبا کا اسی پر ہے علی الخصوص نامی خواندگان کا بلکہ موجد طرز سوز خوانی علی میر صاحب و سلطان علی خان صاحب اور اکثر اہل کمال کی سوز خوانی اور خواندگی، انہی مرثیوں پر تھی۔[2]

دلگیر لکھنوی کا اصل نام لالہ چھنو لال تھا اور وہ طرب تخلص کرتے تھے۔ وہ ۱۷۸۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ مصحفی کے بقول دلگیر کی طبیعت مکتب نشینی کے زمانے سے ہی شعر گوئی کی طرف مائل تھی۔ ۱۷ سال کے سن میں انھوں نے شعر کہنا شروع کیا۔ ابتدا میں غزلیں کہتے تھے اور ایک دیوان بھی مرتب کر چکے تھے، مگر جب مذہب اسلام کی طرف مائل ہوئے تو انھوں نے اپنی غزلیات کا یہ دیوان موتی جھیل (متصل عیش باغ) میں ڈبو دیا تھا۔ دلگیر کی تبدیلیٔ مذہب کا ذکر سب سے پہلے شیخ غلام محی الدین مبتلا مولف طبقات سخن نے کیا تھا۔ ان کا اسلامی نام غلام حسین

---

[1] ایضاً، سید جعفر زیدی، ادارۂ ترویج سوز خوانی، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص: ۲۳

[2] کلیات میاں دلگیر: دلگیر لکھنوی، جلد سوم، لکھنؤ، ۱۸۹۷ء، ص ۳۹۶

رکھا گیا تھا۔ ابتدا میں وہ نواب سعادت علی خان کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان کے انتقال کے بعد غازی الدین حیدر کی رفاقت میں رہنے لگے۔ جب مسلمان ہوئے تو اسی سال تعزیہ خریدا اور مجالس عزا برپا کرنے لگے۔

دلگیر کا انتقال ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ میں ہوا۔ مسعود حسین ادیب سے روایت ہے کہ نخاس کے چڑیا بازار میں جو ٹیڑھی قبر ہے وہ میاں دلگیر کی ہے۔ دلگیر اپنے زمانے کے مشہور مرثیہ گو تھے۔ معاصرین کے مقابلے میں ان کا کلام بہت زیادہ ہے۔ انھیں مرثیہ گوئی میں بے مثال قدرت حاصل تھی اور وہ مرثیہ گوئیوں کے سرتاج تھے۔ انیس سے قبل انھیں تمام مرثیہ گویوں پر فوقیت حاصل تھی۔ ایک روایت کے مطابق مشہور نوحہ ''گھبرائے کی زینب'' بھی دلگیر ہی کا لکھا ہوا ہے؎

دبیر اور انیس نے دلگیر کی مقبولیت سے بھی اپنے لیے تحریک سخن لی ہو تو کیا بعید ہے؟ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے دلگیر کے باب میں سوزخوانی کا ذکر کرتے ہوئے بالکل یہی بات کہی ہے، وہ کہتے ہیں ''مشہور سوزخوانوں کی بدولت ان کے کلام نے انیس ودبیر کے لیے مناسب فضا پیدا کردی؎

ممتاز تحت اللفظ خوان فرحان رضا نے اپنے ایک (غیر مطبوعہ) مضمون میر انیس، سوزخوانی کے تناظر میں انیس کے کلام کا جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

تاہم انیس اور دبیر کو دلگیر پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ رباعی اور سلام کے فن پر بھی مکمل دسترس رکھتے تھے۔ آج بھی سوزخوانی کی ابتدا میں پڑھی جانے والی بیشتر رباعیاں انیس اور دبیر کی تحریر کردہ ہیں۔ یہی صورت حال سلاموں کی بھی ہے۔

میر انیس کی رباعیات کو مختلف عنوانات دیے جاسکتے ہیں جو کہ موضوع سے مطابقت رکھتے ہیں۔ مثلاً رثائی رباعی، اعتقادی رباعی، سماجی رباعی، حمدیہ رباعی، نعتیہ رباعی ومنقبتی رباعی اس کے علاوہ میر انیس نے اخلاق وسماجی نکتہ نظر سے بھی رباعیاں تصنیف کی ہیں اور کچھ رباعیات اپنی شاعرانہ تعلّی وفکر وفن کے حوالے سے بھی رباعیاں لکھی ہیں۔ عہد حاضر میں جب ہر بات کا

؎ ہندو مرثیہ گو شعرا، اکبر حیدری کشمیری، شاہد پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ ۲۰۰۳ء۔ ص: ۵۸، ۵۹

؎ لکھنؤ کا دبستان شاعری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، کراچی، ص ۶۸۶

اظہار (Social media) کے ذریعے کیا جا رہا ہے۔ آپ نے بھی یقیناً میر انیس کی رباعی آغاز محرم میں یا پوسٹ کی ہوگی یا ضرور فیس بک یا واٹس ایپ پر بھیجی یا وصول کی ہوگی۔

اے اہل عزا عزا کے دن آ پہنچے غم کی راتیں بکا کے دن آ پہنچے
فریاد کہ فاطمہ کی بستی اجڑی آبادی کربلا کے دن آ پہنچے

یا پھر

اے یارو محرم کا مہینہ آیا سر پیٹو غم شاہ مدینہ آیا
کیا بیٹھے ہو سر پہ خاک ڈالو احمد کا تباہی میں سفینہ آیا

یہ دونوں رباعیات آغاز محرم میں کم وبیش تمام سوز خواں حضرات حزن ویاس کا ماحول بنانے کے لئے ضرور پڑھتے ہیں۔ ہم سوز خوانی کے تعلق سے میر انیس کی کچھ مشہور رباعیات کے پہلے مصرعے لکھتے ہیں تا کہ کم صفحات میں بات مکمل ہو جائے۔ یہ وہ رباعیاں ہیں جو آپ نے کبھی نہ کبھی ضرور سنی ہوں گی

۱۔ حیرت میں ہوں کیوں جہاں میں آیا پانی
۲۔ جب حر کا گناہ شاہ امم نے بخشا
۳۔ رونے سے جو بہرہ مند ہوں گی آنکھیں
۴۔ مجلس میں مزا اشک بہانے کا ہے
۵۔ کس غم میں یہ لذت ہے جو اس غم میں ہے
۶۔ دشمن جو یزید ستم ایجاد ہوا
۷۔ پیدا ہوئے دنیا میں اسی غم کے لئے
۸۔ جز مدح سخن منہ سے کوئی کم نکلے
۹۔ داغ غم شہ سینے میں گل بوٹے ہیں
۱۰۔ رومال ہے اشکوں سے بھگونے کے لئے
۱۱۔ ہر چشم سے اشکوں کی روانی ہو جائے
۱۲۔ ہر اشک عزادار در یکتا ہے
۱۳۔ رعب شہ ذی جاہ سے تھراتے ہیں

۱۴۔کیا بزم ہے کیا آہ و بکا ہر سو ہے

۱۵۔انس و ملک و حور کی یہ مجلس ہے

۱۶۔وہ مرتبہ حیدر کے وصی کا دیکھا

۱۷۔عصیاں سے کبھی ہم نے کنارا نہیں نہ کیا

۱۸۔مرقد میں انیسؔ نہ کفن میں ہوگا

۱۹۔ہے فصل عزا جدا جدا مجلس ہے

۲۰۔کیا بزم ہے کیا آہ و بکا ہر سو ہے

جیسا کہ چند سطور پہلے عرض کر چکا ہوں کہ رباعیات میر انیسؔ کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ صرف صنف رباعی میں جو کہ بحر ہزج کے چوبیس اوزان میں اور چار مصرعوں میں ہی تخلیق کی جاتی ہے میر انیسؔ نے رباعی کے معیار و مقدار کو اوج ثریا پر پہنچا دیا لیکن اس مطالعے سے گریز کرتے ہوئے اب ہم میر انیسؔ کے سلاموں پر نظر ڈالتے ہیں۔

سلام کو ایک طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ اردو ادب کی صنف سخن غزل کے مماثل ہے یعنی اس میں بھی اشعار میں باہم تسلسل نہیں ہوتا اور معنی و مفہوم میں ہر شعر علیحدہ اور جدا ہوتا ہے۔ میر انیسؔ کے سلام نت نئے مضامین، نادر تراکیب، معنی آفرینی، منفرد ردیف و قوافی، صنعت معنی و صنعت لفظی کا سحر انگیز دفتر ہیں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ ان فنی لوازمات کے باوجود میر صاحب کے سلام انتہائی پرسوز اور مبکی ہیں جو کہ سوزخوانی کے لئے انتہائی ضروری ہیں اور اسی وجہ سے سوزخوان کثرت سے میر انیسؔ کے سلام پڑھتے ہیں۔ ایک تجزیہ میر انیسؔ کے سلاموں کا موضوعاتی اعتبار سے بھی کیا جا سکتا ہے جیسا کہ رباعی کے باب میں درج ہے۔ میر انیسؔ کے مشہور زمانہ سلام جو کہ کثرت سے ہر سوزخواں پڑھتا ہے درج ذیل ہیں

حسینؑ یوں ہوئے اے مجرئی وطن سے جدا
کہ جیسے بلبل ناشاد ہو چمن سے جدا

یا

شبیہ امام زماں کھینچتے ہیں
تصور میں تصویر جاں کھینچتے ہیں

اور

کوئی انیسؔ کوئی آشنا نہیں رکھتے
کسی کی آس بغیر از خدا نہیں رکھتے

اس کے علاوہ بھی متعدد سلام ہیں جو سوز خوانوں کے بستوں کی زینت ہیں

۱۔ گناہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے
۲۔ گذر گئے تھے کئی دن کہ گھر میں آب نہ تھا
۳۔ بے کسی کاشہ کی چہ چارہ گیا
۴۔ سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو
۵۔ کہتی تھی زینب دل خستہ مرے بیر حسینؑ
۶۔ ضبط گریہ ماتم سرور میں ہو سکتا نہیں
۷۔ سنبل تر ہے پریشاں زلف اکبر دیکھ کر
۸۔ کیا کیا نہ زمانہ میں سنا کیا نہیں دیکھا
۹۔ بھر آئی جس نے مزار شہ ذیشاں دیکھا
۱۰۔ لحد میں سامنے جب دفتر حساب آیا
۱۱۔ جز پنجتن کسی سے تولا نہ چاہیے
۱۲۔ بھر آئی قید سے جب عابد بے پر چھوٹے
۱۳۔ بھر آئی جب کہ عیاں ماہ عزا ہوتا ہے
۱۴۔ ہوا جو عشق ثنائے ابوتراب مجھے
۱۵۔ خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے
۱۶۔ ذکر شہ کر کے محبوں کو رلایا میں نے
۱۷۔ خاک در شبیر ہے جاگیر ہماری
۱۸۔ شتاب روضۂ فرزند بوتراب ملے
۱۹۔ صغرا کہتی تھی جو بابا کی خبر ہاتھ لگے

رباعی وسلام کے برعکس مرثیوں کے منتخب بند سوز خوانی میں پڑھنے کے لیے تاریخوں کی قید ہوتی ہے کہ منتخب بند ایام عزا کی کس تاریخ کو پڑھے جارہے ہیں مثال کے طور پر وفات رسول خداﷺ کی تاریخ پر ان کی وفات پر لکھے گئے بند پڑھے جائیں گے بالکل اسی طرح شہادت مولا علیؑ کی تاریخوں میں رمضان اور مولائے متقیان کی شہادت کا مرثیہ اور محرم میں تاریخ وار مضامین کے مرثیہ پڑھے جاتے ہیں۔ مدینے سے سفر کا آغاز، کربلا میں آمد، شہدائے کربلا، جناب صغرا، زعفر جن کے حال کے مرثیے بھی پڑھے جاتے ہیں میر انیس کے کلام سے منتخب کر کے تاریخ وار مرثیے سوز خواں پڑھتے ہیں چند مشہور مرثیے درج ذیل ہیں:

مولا علیؑ:

مسجد میں قتل جب شہ خیبر شکن ہوئے
روؤ کہ روز قتل امیر عرب ہے آج

جناب سیدہؑ:

زہراؑ غم رسول میں بے اختیار ہیں
جب خلق سے وقت سفر فاطمہ ہوا

حضرت مسلم و پسران مسلم:

دربار میں جب کٹ کے یتیموں کے سر آئے

مدینہ سے قافلہ امام حسینؑ کا سفر:

فرزند پیمبر کا مدینے سے سفر ہے

قافلہ حسینیؑ کا کربلا میں ورود:

طے کر چکے حسینؑ جو راہ ثواب کو
جب کربلا میں داخلہ شاہ دیں ہوا

جناب حر:

رن میں جب شہ کی طرف سے حر دیں دار آیا
جنت کے در حر جونہی جا کھڑا ہوا

جنابِ صغرا:

خیمے میں غم شاہ میں بے زار تھی صغرا
غم پدر میں جو صغرا نحیف و زار ہوئی

جنابِ سکینہ:

زندان میں جبکہ دختر شبیر مر گئی
جب داغ بے کسی نہ سکینہ اٹھا سکی

انیس کے سلام، رباعی و مرثیہ کے مطالعہ کی طرح سوز خوانی کے تناظر

انیس کے سلام، رباعی و مرثیہ کے مطالعہ کی طرح سوز خوانی کے تناظر میں ان کے بھائی میر مونس کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ سوز خوانی میں مونس کے مرثیے "جب ہوئے بازوئے علمدار قلم دریا پر" یا "پھر لاش اکبر کی جو مقتل سے اٹھا لائے حسینؑ" انتہائی کثرت سے پڑھے جاتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو برصغیر میں سب سے زیادہ پڑھا اور سنا جانے والا کلام مونس کا سلام "مجرئی غلق میں ان آنکھوں نے کیا کیا دیکھا" ہے جسے پٹیالہ گھرانے کے سوز خوانوں نے اپنی مخصوص بندش میں ایک یادگار سوز بنا دیا۵۔

دلگیر اور انیس کے بعد جس شاعر کا کلام سوز خوانی میں سب سے زیادہ مقبول ہوا بلکہ دلگیر اور انیس سے بھی زیادہ پڑھا گیا وہ مرزا سلامت علی دبیر ہیں۔

سید افضل حسین ثابت رضوی لکھنوی نے مرزا سلامت علی دبیر کی سوانح "حیات دبیر" میں لکھا ہے کہ:

"میر علی صاحب زیادہ تر مشی دلگیر مرحوم کے سلاموں اور مرثیوں پر سوز رکھتے تھے کہ جن کے کلام میں قدرتی طور پر سوز بہت ہے۔ اکثر مرثیہ گو اپنے سلام اور مرثیہ میر علی صاحب کے پاس لے جاتے تھے۔ جس شخص کا سلام سوز رکھ کر میر علی صاحب ایک مرتبہ پڑھ دیتے تھے۔ تمام لکھنؤ میں اور دور دور اس کی شہرت ہو جاتی تھی۔

مرزا دبیر کی شہرت سن کر میر علی صاحب نے کہلا بھیجا کہ میاں اپنے ایک دو مرثیے میرے پاس بھیج دو۔ مرزا صاحب نے شاید تین مرثیے یکے بعد دیگرے بھیجے

۵ میر انیس۔ سوز خوانی کے تناظر میں، فرحان رضا، (غیر مطبوعہ)

(۱) باغ فردوس سے یہ بزم عزا بہتر ہے۔
(۲) بخدا تاج سر عرش خدا ہے شبیر۔
(۳) جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہ شبیر۔

اور میر صاحب نے سوز رکھ کر پڑھے۔ اور خوب رنگ ہوا۔ ان مرثیوں کی زبان اور بندش میر صاحب کو بہت پسند آئی۔ اتفاق سے ایک روز درگاہ یا کربلا میں کسی شخص نے انھیں مرثیوں میں سے ایک مرثیہ منبر پر پڑھ دیا۔ میر علی صاحب بھی موجود تھے۔ ان ذاکر سے پوچھا۔ یہ مرثیہ تم کو کس نے دیا۔ انھوں نے مرزا صاحب کا نام لیا۔ میر علی صاحب کو یہ بات ناگوار ہوئی۔ اپنے کسی بازو یا جوابی کو مرزا صاحب کے پاس بھیجا اور کہلا بھیجا کہ صاحبزادے۔ میر علی، امام حسینؑ کے تصدق سے وہ شخص ہے کہ جس مصنف کا مرثیہ پڑھ دے۔ وہ تمام ہندوستان میں مستند مرثیہ گو مانا جاتا ہے۔ منشی دلگیر اتنے بڑے مشاق مرثیہ گو ہو کر جو مرثیہ مجھ کو دیتے ہیں۔ وہ تین برس تک بغیر میری اجازت کے دوسرے کو نہیں دیتے۔ تم نے یہ مرثیہ جو میر علی کو دیا تھا۔ دوسرے کو کیوں دے دیا۔ کیا تم مستند مرثیہ گو نہیں بننا چاہتے۔ آئندہ اگر تم کو یہ منظور ہو کہ تمہارا کلام میر علی پڑھے۔ اور تم مرثیہ گو مستند بنو۔ تو جو مرثیہ مجھ کو دینا وہ تین برس تک دوسرے کو نہ دینا۔ مرزا صاحب نے یہ پیام سن کر (ان بازو یا جوابی کو) جواب دیا کہ میری طرف سے آداب عرض کی جائے گی اور عرض کی جائے گی کہ آپ اول تو سید دوسرے بزرگ، تیسرے ذاکر ہر طرح واجب التعظیم ہیں۔ میں ہر طرح تعمیل حکم کو حاضر ہوں مگر یہ جو ارشاد ہوا کہ مستند مرثیہ گو بننا چاہو۔ تو جو مجھے مرثیہ دینا وہ تین سال تک دوسرے کو نہ دینا۔ اس کا یہ جواب ہے کہ

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابرست
رفتن بپائے مروی ہمسایہ در بہشت

میں اگر مستند مرثیہ گو بننا چاہتا ہوں تو امام حسینؑ کی امداد اور اپنی محنت و طبع خداداد ہے۔ اور یہ بات شاید میری مروّت سے بھی دور ہوگی کہ کوئی ذاکر وغیرہ مجھ سے مرثیہ مانگے اور میں یہ کہہ کر اس کی دل شکنی کروں کہ میر علی صاحب کا حکم نہیں۔ اس لیے مرثیہ میں نہیں دے سکتا۔ مجھ سے یہ شرط نبھ نہیں سکتی۔ میں مجبور ہوں۔

اس دن سے پھر میر علی صاحب نے مرزا صاحب کی تصنیف کوئی اور مرثیہ نہیں پڑھا۔ مگر تین

مرثیوں کے پڑھنے سے مرزا صاحب کے کلام نے ایسا ان کے دل پر اثر ڈالا تھا کہ ان کا دل مرزا صاحب کی بندشوں اور دلکش اور درد انگیز الفاظ اور اشاروں کو یاد کیا کرتا تھا۔ اپنی وضع داری سے مجبور تھے۔ آخرالامر یہ ترکیب کی کہ مرزا صاحب کے اصلاحی مرثیوں پر (جو مرزا صاحب کے شاگرد کہتے تھے) منگا منگا کر سوز رکھے۔ اور پڑھے، چنانچہ یہ مرثیہ ع

بے چین تھی صغرا جو فراق پدری سے

بشیر (رام پرشاد) سے منگوایا اور سوز رکھ کر پڑھا۔ جو آج تک بعض سوز خواں پڑھتے ہیں''۔

سید افضل حسین ثابت رضوی لکھنوی مزید لکھتے ہیں کہ:

''میر علی صاحب کے بعد تین سوز خوانوں نے نام نکالا (۱) میر احمد صاحب، (۲) احمد علی خان صاحب، (۳) میر زکی صاحب۔ میر احمد صاحب نے عموماً مرزا صاحب کے مرثیوں کو سوز خوانی کے لیے منتخب کیا۔ حسب ذیل مرثیوں پر ان کے سوز رکھے ہوئے سنے جاتے ہیں۔

(۱) آمد ہند کا غل عترت شبیر میں ہے۔

(۲) ہند جس وقت محل سے سوئے زنداں آئی۔

(۳) جب یزید اپنے گناہوں سے پشیماں ہوا۔

(۴) دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے۔

(۵) عابد کو جب یزید سے بابا کا سر ملا۔

میر علی محمد بھی مرشد آباد میں ملازم تھے۔ اور بعدہ میر بندہ حسین صاحب کے یکتائے فن سمجھے جاتے تھے۔ میر علی محمد صاحب بھی مرزا دبیر مرحوم کے شاگرد تھے۔ وہ سوز خواں بھی تھے۔ تحت اللفظ خواں بھی تھے اور شاید سلام وغیرہ بھی کہتے تھے۔ میر علی محمد صاحب کے بھانجے اور داماد میر منجھو صاحب بھی سوز خوانی میں کامل سمجھے جاتے تھے اور سوز واقعی خوب پڑھتے تھے۔ المختصر یہ سوز خوانوں کے تمام گھرانے اس طرف جھک پڑے اور سبھوں نے مرزا صاحب کے مرثیوں کو سوز خوانی کے لیے منتخب کیا۔ یہی سبب ہے کہ مرزا صاحب کے مرثیے سوز میں جس کثرت سے پڑھے جاتے ہیں۔ دوسرے کسی مرثیہ گو شاعر کے مرثیے نہیں پڑھے جاتے اور سنا ہے کہ میر بندہ حسین صاحب اور میر علی محمد صاحب کا یہ قول تھا کہ مرزا دبیر مرحوم کے الفاظ اور ترکیبیں اور بندشیں سوز میں پڑھنے کے لیے جیسی مناسب واقع ہوئی ہیں دوسرے کی نہیں ہیں۔ مرزا صاحب کے مرثیے میں یہ ایک

آسانی کتنی بڑی ہے کہ ۲۰۰ یا ۱۵۰ بند کے مرثیہ میں سے ۱۵ یا ۱۲ بند سوز میں پڑھنے کو چھانٹ لو۔ مرثیہ بے ربط نہ ہوگا۔ جا بجا مطلع لگے ہوئے ہیں جس مطلع سے چاہو مرثیہ شروع کر دو۔ گویا ایک سنہری زنجیر ہے جس کی کڑیاں پیوستہ و مسلسل بھی ہیں اور الگ بھی ہیں، حسب ضرورت چند کڑیاں لے کر چھوٹی چھوٹی کئی زنجیریں بن سکتی ہیں۔ ہر زنجیر خود عروس سخن کے لیے زیور بن جاتی ہے۔ ان کا مرثیہ ایسا خوش نما سانچہ ہے جس میں سوز آسانی سے ڈھل جاتا ہے اور جو سوز خواں اس فن کو تھوڑا بھی جانتا ہے وہ بھی ان کے مرثیہ پر سوز آسانی سے رکھ لے گا۔ دوسروں کے مرثیوں کو مختصر کرنا اور سوز رکھنا ذرا مشکل ہے۔ ہاں کوئی سوز خواں تحت لفظ خوانوں کی طرح چالیس پچاس بند پڑھے تو مضائقہ نہیں۔ اوروں کے مرثیہ بھی خوب پڑھ سکتا ہے۔ عموماً سوز خوانوں کا یہ مقولہ اور عقیدہ ہے کہ جس مجلس کو ہم درہم برہم دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ رنگ نہ ہوگا۔ اس میں ہم مرزا صاحب ہی کا مرثیہ پڑھتے ہیں، وہی رنگ دیتا ہے۔ دوسرے کا مرثیہ رنگ نہیں دیتا، اور یہی سبب ہے کہ فی صدی ۷۰، ۸۰ مرثیہ مرزا صاحب کے سوز میں پڑھے جاتے ہیں اور اصلی سبب مقبولیت من جانب اللہ ہے سچ ہے

قبول خاطر و لطف سخن خداداد است"[۲]

۲؎ حیات دبیر، سید افضل حسین ثابت رضوی لکھنوی۔ مولوی غلام عباس تاجر کتب، لاہور۔ ۱۹۱۳ء، ص: ۷۹ تا ۸۵، (تلخیص)

ساتواں باب

ہندوستان میں سوز خوانی کے اہم مراکز:
حیدر آباد (دکن)، لکھنؤ اور امروہا

دکن عہد وسطی سے عزاداری کا اہم مرکز رہا ہے۔ یہ عہد بہمنی سلطنت سے شروع ہوتا ہے۔ جس کا قیام ۷۴۷ھ میں ہوا۔ یہ سلطنت ۹۰۰ھ تک قائم رہی۔ بہمنی سلطنت کے شیعہ فرماں رواؤں نے عزاداریٔ امام حسین علیہ السلام کو بڑا فروغ دیا۔ ۹۰۱ھ میں بہمنی سلطنت کا شیرازہ منتشر ہوگیا اور دکن میں پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں۔ ان میں عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں نے جہاں دکنی تہذیب کے ارتقا اور بقا کے لیے سارے سامان مہیا کیے وہیں کربلا کے شہیدوں کے غم کو عام کرنے اور گھر گھر پہنچانے میں بڑی جدوجہد کی۔ یہ حکومتیں ۹۰۱ھ سے ۱۰۹۸ھ تک قائم رہیں۔ قریب قریب، ان دو صدیوں میں کئی بڑے شاعر پیدا ہوئے جنھوں نے مظلوم کربلا کے مرثیے کہے۔ خود بادشاہان وقت بھی ان مرثیہ نگاروں میں شامل ہیں۔ تاریخ اردو ادب نے محمد قلی قطب شاہ کو پہلا مرثیہ گو کہا ہے۔ یہی بادشاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر اور حیدر آباد فرخندہ بنیاد کا بانی ہے۔

حیدر آباد کی مجلسوں اور توقیر عزاداری میں باضابطگی ۹۸۸ھ سے پیدا ہوئی۔ محمد قلی قطب شاہ بڑا شیدائے حسین، ابن علی تھا۔ اس نے ۱۰۰۵ھ میں حیدر آباد کو آباد کرنے کے ساتھ ساتھ عظیم الشان بادشاہی عاشور خانہ کی تعمیر بھی کی اور یہاں نہایت شاندار مرصع اور جواہر نگار علم ایستادکیے عشرۂ اول میں صبح سے شام تک عاشور خانہ میں مجالس عزا منعقد ہوتی تھیں۔ جن میں مجالس شب میں بادشاہ سلامت خود شریک ہوتے تھے۔

ان مجالس میں منبر پر خوش الحان مرثیہ خوان نہایت درد انگیز طرزوں میں مختلف شعرا کے مرثیے پڑھتے تھے۔ عہد قلی قطب شاہ میں خود اس کا تو تصنیف مرثیہ اس کی موجودی میں پڑھا جاتا تھا۔ اگر چہ کہ سرکاری زبان فارسی تھی لیکن اردو شعر و ادب کی اس دور میں بڑی دھوم دھام تھی۔ شاہی سرپرستی کی وجہ سے اس زبان کو تیزی سے فروغ ہو رہا تھا۔ قلی قطب شاہ کے عہد سے ابوالحسن تاناشاہ تک ۹۸۸ھ تا ۱۰۹۸ھ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی نے خوب ترقی کی۔ ۹۸۔۱۰۹۷ھ میں عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے دکن پر قبضہ کر لیا اور اس نے یہاں کی سلطنت کے ساتھ ساتھ تہذیب و تمدن کی بھی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

یہ وقفہ کچھ زیادہ طویل نہیں رہا۔ آصف جاہ اول نے ۱۱۳۶ھ میں اپنی حکومت قائم کی اور مغل سلطنت سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ آصف جاہ کے عہد میں پھر دکنی روایتوں میں زندگی آ گئی۔ عہد آصف جاہی میں قطب شاہی روایات عزاداری کا احیا بھی ہوا۔ اس خاندان کو بھی مظلوم کربلا سے بڑی عقیدت رہی ہے۔

آصف جاہ ثانی نے ۱۱۸۴ھ میں سلطنت کے پایہ تخت کو اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل کر دیا۔ یہ بات حیدرآباد کے حق میں فال نیک ثابت ہوئی۔ نظام علی خاں کو مظلوم کربلا سے غیر معمولی عقیدت تھی۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے وزیر ارسطو جاہ کو ان کے فرزند کے انتقال کے صدمہ کو دور کرنے کے لیے اپنے ایک صاحبزادہ کو اس اجازت کے ساتھ عطا فرمایا کہ وہ اسے مذہب امامیہ پر چلا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ازیں سکندر جاہ کا عقد ارسطو جاہ کی پوتی سے کیا۔

آصف جاہ کے عہد میں نوازش علی خاں شیدا، سرگروہ شاہی مرثیہ خوانان کی مساعی سے بادشاہی عاشور خانہ ایک مرتبہ پھر تعمیر جدید سے آراستہ ہوا۔

اسی عہد میں اسی طرح گھر گھر عاشور خانے ایستادہ ہوتے تھے جس طرح عہد قطب شاہیہ میں ہوا کرتے تھے۔ عشرۂ اول میں مرثیہ خوان بہت مصروف رہتے تھے۔ یہی تسلسل آج تک قائم ہے اور مرثیہ خوانی اب خاندانی ہو چکی ہے۔ اس طبقہ کے افراد سے ہٹ کر کوئی مرثیہ پڑھتا ہے تو وہ شوقین کہلاتا ہے، شوقین مرثیہ خوانوں کو خاندانی مرثیہ خوانوں کا مقام نہیں دیا جاتا۔

حیدرآباد کی مرثیہ خوانی ہندوستان کے دوسرے مقاموں کی مرثیہ خوانی سے بالکل مختلف ہے، یہاں کے اساتذہ نے مرثیہ کی طرزوں کے بنانے میں کچھ ایسا طریقہ اختیار کیا ہے کہ اس پر

گائیکی موسیقی کا کوئی قاعدہ منطبق نہ ہو، اور غم کے تاثر میں شدت بھی قائم رہے۔ اس خصوص میں خوشحال خاں نے بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کے علاوہ حیدرآباد کے دو اور اہم مرثیہ خوان ہیں جنھوں نے یہاں کی مرثیہ خوانی کو دوسری جگہوں کی مرثیہ خوانی سے الگ کرلیا۔

واحد خاں مرحوم اور حسن خاں مرحوم، حیدرآباد کی تاریخ مرثیہ خوانی کی ناقابل فراموش شخصیتیں ہیں۔ انھوں نے مرثیہ کی جو طرزیں بنائی ہیں وہ آج تک رائج ہیں، یہ ایسی طرزیں ہیں جن کو علمائے عظام اور فقہائے کرام کو سننے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا۔

تاریخ مرثیہ خوانان تاریخ عزا کا ایک اہم جزو ہے۔ مرثیہ خوانوں نے مظلوم کربلا کے غم کو عام کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ مرثیہ خوانوں کا مستقل طبقہ عہد قطب شاہیہ ہی میں پیدا ہوگیا تھا۔ عہد نظام علی خاں میں اس کی شاہی سرپرستی پھر بحال ہوگئی۔ ارسطو جاہ کے دربار سے مرثیہ خوانوں کی کوئی ۷ اجماعتیں وابستہ تھیں۔ آصف جاہ ثانی کے درباری مرثیہ خوانوں کی جماعتوں کی تعداد ۵۰ تھی جس کے سرکردہ میر نوازش علی خاں شیدا تھے جو آصف جاہ کے میر سامان بھی تھے۔

حیدرآباد کی مرثیہ خوانی میں محض خوش الحانی ہے۔ آواز کا یہ تناسب بہت پر اثر ہے۔ مرثیہ کی ان مقامی، طرزوں میں سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ آواز کا طول انہی لفظوں کے ساتھ ہے جن میں بینیہ رخ زیادہ ہے۔ چونکہ مسدس کی شکل کے مرثیے پڑھے جاتے ہیں، اس لیے ہر بند کا چوتھا اور چھٹا مرصع بند کا حاصل ہوتا ہے، مرثیہ خوان کی توجہ بھی ان ہی مصرعوں پر رہتی ہے ان ہی مصرعوں کو ادا کرنے میں پوری مہارت صرف کرتے ہیں۔ بازو دار بھی ان ہی مصرعوں پر جواب دیتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بند کا بند بینیہ بن جاتا ہے۔ مرثیہ خوان مخصوص لحن کے ساتھ اس پورے بند کو اپنے بازو داروں کے ساتھ پڑھتا ہے اور گریہ و بکا کے جذبہ کو انگیخت کرتا ہے۔ مرثیہ کی طرزوں میں آواز کا طولی فاصلہ مصرعوں کے مفہوم سے زیادہ قریب رہتا ہے۔ آہ و زاری کا تاثر پیدا کرنے کی کوشش مسلسل رہتی ہے۔ مرثیہ کی ادائی میں جہاں آواز کے اتار چڑھاؤ کو دخل ہے وہیں کہیں کہیں حرکات سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً مرثیہ کے بعض مخصوص مصرعوں پر مرثیہ خوان کا سر برہنہ ہوکر مجلس کو اشاروں سے مخاطب کر کے مصرع یا بند پڑھنا اور بازو داروں کی مدد سے اس کو بار بار دہراتا ہے۔

مرثیہ خوانی منبر سے بھی ہوتی تھی۔ جیسا کہ قطب شاہی مجلسوں کے تذکرے میں مذکور

ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ تکیہ پر بیٹھ کر مرثیہ خوانی کا رواج کب سے ہوا۔ کیوں کہ ابتدا میں مرثیہ خوانی اور واقعہ خوانی منبر سے ہوا کرتی تھی۔ قطب شاہی دور میں "جماعت" کی اصطلاح یا اسی کے مترادف کوئی اشارہ ہمیں نہیں ملتا۔

تذکرہ ذاکرین کے مؤلف محمد علی خان نے ماہ لقابائی کے ہاں مجلسوں کے انعقاد کی جو تفصیل بیان کی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس خاتون کے یہاں مستقل مرثیہ خوانوں کی جماعتیں تھیں جن کی وہ سرپرستی کرتی تھی۔ ایام عزا میں مجلس عزا اس طرح ہوتی تھی کہ منبر پر واقعہ خوانی سے پہلے منبر سے نیچے مقررہ جگہ پر مرثیہ خوان مرثیہ پڑھتے تھے، ممکن ہے تکیہ پر پڑھنے کا رواج اسی عہد سے ہوا ہو۔ لیکن یہ بات قطعیت سے نہیں کہی جا سکتی۔ یہ ممکن ہے کہ قطب شاہی عہد میں اس کا رواج ہو چکا ہو کیونکہ آداب عزا میں باضابطگی اسی عہد سے ہوئی ہے اور واقعات خوانی کا رواج بھی موجود تھا۔

تکیہ پر ذاکری کی عظمت منبر کی ذاکری سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اسی لیے مرثیہ خوان کو ذاکر اول کہا جاتا ہے۔ عام طور پر مجلس کے بیچوں بیچ ایک سوزنی بچھا دی جاتی ہے اس پر تکیہ رکھا جاتا ہے۔ مرثیہ خوان اس تکیہ پر اپنا بستہ رکھتا ہے، جس میں مرثیوں کی بیاضیں ہوتی ہیں۔ بازو دار اس کے دائیں، بائیں اور پیچھے بیٹھ جاتے ہیں تکیہ کے سامنے اگر بتیاں جلائی جاتی ہیں اور پانی کی صراحی اور گلاس رکھ دیا جاتا ہے۔

جس شہید کی مجلس ہوتی ہے اسی کے حال کا مرثیہ پڑھا جاتا ہے۔ ہر مرثیہ کے سارے بند پڑھنا ضروری نہیں ہوتا بلکہ مجلس کے مناسب حال بند پڑھے جاتے ہیں۔

بعض مخصوص مجالس میں مخصوص مرثیے پڑھے جاتے ہیں۔ ان مجالس میں صرف بکا ہوتی ہے اور دو چار بند سے زیادہ نہیں پڑھے جاتے۔ ان مجالس میں مرثیہ خوان دوران مرثیہ خوانی کھڑے ہو کر ایک مصرع دہراتا اور مرثیہ ختم کر دیتا ہے۔

جیسے عصر عاشور کو "سینہ پہ بھالا رکھ کر گرایا حسین کو"

یکم صفر صبح کو۔

"کہہ دے کوئی علی سے یہ دارالسلام میں
زینب کا داخلہ ہوا دربار شام میں

اربعین کے زمانہ میں:

ورم ہے شانوں پہ رکھتے ہیں استخواں ناناﷺ
یہ میرے بازو پہ رسی کے ہیں نشاں ناناﷺ

مرثیہ کی حیدرآبادی طرزوں کی حفاظت اس لیے ضروری ہے کہ یہی وہ طرزیں ہیں جن پر شریعت مانع نہیں ہے، اور علما بے تکلف اس لحن میں مرثیے سنتے ہیں۔

یہاں آخری بات یہ عرض کرنی ہے کہ ہمارے بزرگوں نے بہت سوچ سمجھ کر مرثیوں کی طرزیں بنائی ہیں۔ خاندانی مرثیہ خوانوں کے یہاں جتنے مرثیے ہیں، ان سب کی طرزیں ان ہی مرثیوں کے لیے مخصوص ہیں، کئی مرثیے ایسے ہیں جو ایک ہی بحر میں ہیں، لیکن مرثیہ کے مزاج کے لحاظ سے ان کی طرزیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ مرثیہ ان ہی مخصوص طرزوں میں اپنی مرثیت کا بھرپور تاثر دیتا ہے[1]

صصام علی گوہر کے مضمون کے اقتباس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ "سوزخوانی" رقص و موسیقی کی تشنگی دور کرنے کے لیے شاہان لکھنؤ کی ایجاد و اختراع نہیں تھی تاہم یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ اس فن نے جیسا عروج لکھنؤ میں پایا ویسا ہندوستان کے کسی اور حصے میں نہیں پایا۔

لکھنؤ میں سوزخوانی کے نامور اساتذہ میں حیدری خان، میر علی، میر احمد، ناصر خاں، میر علی حسن، میر بندہ حسن، احمد علی خان، میرزکی، میر علی محمد، منجھو صاحب، زندے صاحب اور ولی حیدر ولی کے نام سرفہرست ہیں۔ جن کا تفصیلی احوال اس کتاب کے تیسرے باب سوزخوانی کے چند ابتدائی اساتذہ میں تفصیل کے ساتھ رقم کیا جا چکا ہے۔

............☆☆☆............

امروہا میں عزاداری بڑے تزک و احتشام سے ہوتی ہے، سوزخوانی عزاداری کا اہم جز ہے۔ یہ فن امروہا والوں نے سرزمین اودھ سے حاصل کیا اور اپنے مقامی انداز میں اس کو ڈھالا اور مزید جدتیں پیدا کیں اسی وجہ سے امروہا کی سوزخوانی کا علیحدہ مزاج ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد امروہا سے سید داد علی اور سید ارشاد علی (محلہ بنگلہ)، سید فرحت علی (محلہ

---

[1] حیدرآباد (دکن) کی مرثیہ خوانی، صصام علی گوہر، مشمولہ: صدائے جعفریہ، عزاداری نمبر، حیدرآباد (دکن) ص: ۱۲۸تا۱۳۲

کنکوئی) اور سید امید علی (محلہ مچھرہ) لکھنؤ گئے اور انداز سوز خوانی سیکھا۔

استاد خادم حسین تقریباً ۱۲ برس لکھنؤ میں رہے اور فن سوز خوانی میں دست رس حاصل کی۔ انھوں نے جب مرثیہ "دیار شام میں جس دم حرم تمام آئے" اپنے مخصوص انداز میں امام باڑہ علمدار علی خاں میں پڑھا سامعین سن کر رقت میں بے حال ہو گئے اور دیواروں سے سر ٹکرانے لگے۔ سید داد علی اور سید ارشاد علی کی پڑھت انتہائی منفرد تھی اور ان دونوں کی ان تھک محنت کی وجہ سے محلہ بنگلہ کی سوز خوانی کو ایک منفرد مقام حاصل ہوا۔ سید نذر حسین ابن یاور علی اپنے چچا سید ارشاد علی کے ساتھ سوز خوانی کرتے تھے۔

حاجی سید مقبول احمد و سید منظور احمد اپنے دیگر برادران محمود احمد وغیرہ نیز اپنے چچازاد بھائیوں سید زاہد حسین و عابد حسین پسران سید ارشاد علی اور بھتیجے سید علی مستحسن مرثیے کو انتہائی عمدہ انداز میں پڑھتے تھے۔ ان حضرات کے بعد سید سبطین احمد، سید متقی حسن، حاجی سید اصطفیٰ حسن اور میر سید محمد نبی نے اپنی آواز سے سوز خوانی میں ایک منفرد جگہ بنالی۔

سید فرحت علی (محلہ کنکوئی) ایک بڑے سوز خوان تھے وہ بڑی خوش الحانی کے ساتھ مرثیہ کو دوگن پر پڑھتے تھے جس سے سننے والے بہت محظوظ ہوتے تھے۔ ان کو یہ کمال حاصل تھا کہ ایک مرثیہ کو چھ راگنیوں میں پڑھا، پہلا بند کسی راگنی میں دوسرا بند کسی اور راگنی میں اسی طرح چھ بند علیحدہ علیحدہ راگنیوں میں پڑھ کر داد حاصل کرتے۔

سید گل حسن کے لیے مشہور ہے کہ جو سوز وسلام اور مرثیہ کنکوئی، منڈی اور بڑے دربار میں پڑھے جاتے ہیں، بیشتر کی طرزیں ان کی تیار کی ہوئی ہیں۔ ان کے شاگردوں میں سید ذکا الحسنین، سید محمد احمد، سید وصی احمد شامل ہیں۔ سید وصی احمد کی آواز میں کافی رنگینی تھی، سید ارمان علی سید فرقان علی یہ سب لوگ سید ارمان علی کی معیت میں سوز خوانی کرتے تھے۔

سید مہتاب حسن (بنے) اور ان کے دونوں بھائیوں آفتاب حسین (دولہا) اور نوشہ حسن (نوشہ) محلہ دربار کلاں اپنے مخصوص انداز میں مرثیہ خوانی کرتے تھے۔

ہندوستان کے موجودہ سوز خوانوں میں سید حسن امام، سبط سجاد، تبارک حسین و مبارک حسین ہیں۔ امام باڑہ دربار کلاں میں سوز خوانوں میں جو بزرگ شامل تھے، ان میں سید منہاج الحسن خاں، سید تاج الحسن خاں، سید معراج الحسن خاں، سید نواب الحسن، سید گل حسن، سید مقداد

حسن، سید شجاعت الحسن ان کے تاریخ وار مرثیے مخصوص تھے جس میں یہ فرداً فرداً مرثیہ پڑھا کرتے تھے۔ باقی سب ان کا ساتھ دیتے تھے۔

سید عزیز الحسن عرف جنا کے مشہور سوز خواں گزرے ہیں جن کا منفرد انداز سامعین پر رقت طاری کر دیتا تھا اور جب وہ اپنے مخصوص انداز میں......

شور ہے شام میں آج اہل حرم چھٹتے ہیں

پڑھتے تھے تو کہرام برپا ہو جاتا تھا۔

سید میر علی عرف میرن (محلہ کٹرہ) اپنے ساتھی سید بو علی کے ساتھ مل کر سوز خوانی کرتے تھے، بو علی صاحب کو موسیقی سے کافی لگاؤ تھا۔ ان کی مرثیہ خوانی میں سروں کی آمیزش ہوتی تھی۔

سید ضامن حسین، سید محمد رضا جمعہ، ڈاکٹر اشرف، سید عتیق حسن، سید لئیق حسن، سید خلیق حسن، سید امیر حسن، سید علی مجاہد زیدی عرف چاند، استاد نبی حسن، استاد سید علی اصغر، سید محمود حسن، سید منور حسن، سید ولی حسن، سید اصغر حسن عرف جرمن، سید مختار احمد، منشی وصی احمد، سید تقی حیدر، سید توقیر حسن، ماسٹر محمد حیدر عرف بھورے و فیضان علی اس وقت کے کامیاب سوز خوان تھے۔ دلگیر کا مرثیہ......

قید سے چھوٹ کے جب سید سجاد آئے

سب سے پہلے مشہور سوز خواں سید حیدر علی نے اپنے منفرد انداز میں پڑھنا شروع کیا۔ یہ مرثیہ خواں حضرات خصوصیت و انہماک سے اس خدمت کو باحسن خوبی انجام دے رہے ہیں۔

سید عزیز الحسن نقوی عرف جنا کا شمار امروہا کے معروف سوز خوانوں میں تھا، ان کا مرثیہ پڑھنے کا اپنا منفرد انداز تھا۔ وہ ہمیشہ تاریخی مرثیے پڑھا کرتے تھے۔

ہندوستان کی تقسیم کے بعد جو حضرات پاکستان ہجرت کر کے کراچی، لاہور، کوئٹہ اور دوسرے شہروں میں آباد ہوئے انھوں نے سوز خوانی اسی انہماک سے جاری رکھی اور عزاداریٔ امروہا کو اسی آب و تاب سے قائم رکھا۔ سید استجاب حسن (محلہ کٹرہ) نے زیادہ تر اپنی توجہ کشکوئی کے پڑھے جانے والے مراثی پر مرکوز رکھی اور انھی طرزوں کو اپنائے رکھا۔ اب ان کے پوتے یہ فرض بخوبی انجام دے رہے ہیں۔

سید وصی الحسن (محلہ دربار کلاں) ہجرت کر کے کوئٹہ اور بعد میں کراچی منتقل ہو گئے اپنے

بیٹوں تقی الحسن اور نقی الحسن کے ہمراہ مرثیہ خوانی میں پیش پیش رہے۔ان کے نواسے پسران کاظم حسین بڑی آب وتاب سے مرثیہ خوانی کر رہے ہیں۔

سید سبطین احمد اور سید متقی حسن (محلہ بگلہ) کراچی منتقل ہوئے اور مرثیہ خوانی کرتے رہے خصوصاً چہلم کے تعزیہ میں "قید سے چھوٹ کے جب سید سجاد آئے" مخصوص انداز میں پڑھتے رہے ان کے انتقال کے بعد حضور برادران نے طویل عرصے تک یہ مخصوص مرثیہ پڑھا اب یہ فریضہ ان کی اولادیں انجام دے رہی ہیں۔

سید آباد محمد (محلہ قاضی زادہ) مشرقی پاکستان منتقل ہوئے اور جو فن انھوں نے اپنے والد سید علی اصغر سے سیکھا تھا پاکستان کی مرثیہ خوانی میں منفرد ہو گئے اور اپنی اولاد سمیت اپنے نواسوں اور نواسیوں کو اس فن کو پوری آب وتاب سے منتقل کیا۔

سید باقر رضا (محلہ قاضی زادہ) جب پاکستان منتقل ہوئے تو مشہور مرثیہ......

"جب چلے یثرب سے سبط مصطفؐے سوئے عراق"

۸ محرم کے مرکزی جلوس کے آغاز میں پڑھنے کی ذمہ داری نبھاتے رہے اور سید علی رضا اور سید جعفر رضا بازوئے خاص کی حیثیت سے ان کا ساتھ دیتے رہے۔ان کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا اسد رضا جلوس کی ابتدا اور اختتام پر یہ مرثیہ پڑھتا ہے۔[۲]

---

۲ امروہے کی سوزخوانی، مشمولہ: عزاداری امروہا، ہمارا مذہبی ورثہ، پروفیسر منظور حسنین آرزو، ۲۰۱۷ء، کراچی، ص:۲۱۱ تا ۲۱۳، (تلخیص)

آٹھواں باب

پاکستان میں سوزخوانی کا آغاز وارتقا

قیام پاکستان کے بعد یہاں مجالس عزا میں سوزخوانی کا رواج معدوم ہوتا جارہا تھا۔ ایسے میں سوزخوانی کی ترویج، فروغ اور تربیت کی غرض سے اولین تنظیم کا قیام علامہ رشید ترابی کی زیر سرپرستی ۱۹۴۹ء میں کراچی میں عمل میں لایا گیا۔ اس انجمن کے بانی ارکان میں جناب آغا مقصود مرزا، جناب سید آفتاب علی کاظمی اور استاد معشوق علی خاں صاحب حیدری (الوری) سرفہرست تھے۔ بعد میں جناب عظیم الحسن اور ۱۹۵۶ء میں جناب آباد محمد نقوی زائر بھی سید آفتاب علی کاظمی اور استاد معشوق علی خاں صاحب کی دعوت پر انجمن سے وابستہ ہو گئے۔ انجمن کے پہلے صدر جناب آغا مقصود مرزا اور جنرل سیکریٹری جناب سید آفتاب علی کاظمی مقرر ہوئے۔

خدمات

انجمن نے نہ صرف سوزخوانی کے لیے مخصوص مجالس کے انعقاد کی بنیاد ڈالی بلکہ انجمن کی کوشش اور لگن سے کراچی میں منعقد ہونے والی مجالس میں سوزخوانی پابندی سے ہونے لگی۔ ان مجالس میں سوزخوانی کا انتظام انجمن کی جانب سے کیا جاتا تھا اور سوزخوان کی آمدورفت سمیت کسی قسم کے ہدیہ کا تقاضا نہیں کیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں اساتذہ سوزخوانان کی زیرنگرانی نوآموز سوزخوانوں کے لیے تربیتی نشستوں کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا۔ یہ نشست ہائے سوزخوانی، ابتدا میں سید آفتاب علی کاظمی کی رہائش گاہ واقع پی ای سی ایچ سوسائٹی میں اور بعدہ امام بارگاہ شاہ کربلا ٹرسٹ، رضویہ سوسائٹی اور انجمن کے ایک سینئر ممبر جناب رضی حسن خاں صاحب کی رہائش گاہ واقع علی بستی پرانا گولیمار میں منعقد ہوتی تھی۔

سالانہ مجلس سوزخوانی

خطیب عالم اسلام علامہ رشید ترابی اعلیٰ اللہ مقامہ نے ۱۹۵۷ء میں ایک سالانہ مجلس سوزخوانی ۱۹ صفر کو اپنی سرپرستی میں قائم فرمائی اور اس مجلس کا کل انتظام و انصرام انجمن سوزخوانان کراچی کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ پہلی مجلس سوزخوانی ۱۹ صفر ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۳ ستمبر ۱۹۵۷ء کو مرکزی امام بارہ لیاقت آباد میں منعقد ہوئی۔ ۱۹۵۸ء سے یہ مجلس ہر سال ۱۹ صفر ہی کو حسینیہ ایرانیان میں منعقد ہوتی رہی۔ اس دوران ایسا بھی ہوا کہ یہ مجلس صبح کے اوقات میں حسینیہ ایرانیان میں اور شام کے اوقات میں مرکزی امام بارہ لیاقت آباد میں منعقد ہوتی رہی مگر کچھ عرصہ کے بعد شام کی مجلس موقوف کر دی گئی۔ غالباً ۱۹۷۳ء میں یہ مجلس عزاخانہ زہرا (نزد خراسان) منتقل کر دی گئی جہاں یہ پابندی کے ساتھ جاری و ساری ہے۔

ابتدائی دور میں اس مجلس میں زیادہ سے زیادہ آٹھ یا نو سوزخوان شرکت کر سکتے تھے کیونکہ اس مجلس میں صرف ایسے صاحب بستہ سوزخوان ہی سوزخوانی کر سکتے تھے جو عشرہ پڑھ سکتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد حسب فرمائش بانی عزاخانہ زہرا جناب آغا احمد شیرازی، سوزخوانوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا۔ انجمن نے بھی اس تجویز کو بہتر سمجھا کہ مبتدی سوزخوانوں کو بھی موقع دیا جائے تاکہ سوزخوانی کا ذوق آنے والی نسلوں میں پیدا ہو اور سوزخوانی کو فروغ حاصل ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس مجلس میں شرکت کے لیے نوجوانوں نے اساتذہ سے سیکھ سیکھ کر حصہ لینا شروع کیا اور اس مجلس میں سوزخوانوں کی تعداد ۲۸ سے ۳۰ تک پہنچ گئی اور اس میں ہر سال اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اب یہ مجلس صبح ۱۰ بجے سے ظہرین کا وقفہ نکال کر شام ۵ بجے تک پورے جوش و خروش اور خشوع و خضوع کے ساتھ جاری رہتی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی جاری رہے گی۔

اس انجمن کی کوششوں کے نتیجے میں ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی ویژن سے دوران محرم سوزخوانی کے پروگراموں کا آغاز بھی ہوا۔ انجمن سوزخوانان کراچی اب بھی قائم و دائم ہے اور پورے سال منعقد ہونے والی مجالس عزا کے لیے حتی المقدور اپنے وسائل کو استعمال میں لاتے ہوئے ذاکرین کا بندوبست کیا کرتی ہے۔

انجمن میں صدر کے منصب پر فائز رہنے والے معروف سوزخوانوں میں آغا مقصود مرزا، سید

آفتاب علی کاظمی، آغا مسعود مرزا، معشوق علی خان حیدری، سید آباد محمد نقوی زائر امروہوی، سید مظاہر علی کاظمی اور فائق حسین رضوی شامل ہیں۔

۱۹۹۷ء میں اس انجمن سے وابستہ مشہور سوز خوان سید سبط جعفر زیدی نے سوز خوانی کے فروغ کے لیے ادارۂ ترویج سوز خوانی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس نے نہ صرف نئے سوز خوانوں کی تربیت کی بلکہ ان کے استفادے کے لیے بستہ کے عنوان سے ایک اہم کتاب بھی مرتب کی اور اپنی اور اساتذہ کی سوز خوانی پر مشتمل کئی آڈیو کیسٹ بھی جاری کیے۔

پاکستان کے چند معروف سوز خوان

(بہ اعتبار تاریخ وفات)

ا۔ فیروز علی کربلائی

فیروز علی کربلائی لاہور کے نامور سوز خوانوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا انتقال ۲۹ جون ۱۹۶۴ء کو لاہور میں ہوا اور وہ مومن پورہ کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

فیروز علی کربلائی کے فن سوز خوانی کے وارث ان کے فرزند نذیر حسین کربلائی اور ان کے پوتے جمیل ترابی (فرزند اثر ترابی) قرار پائے جبکہ فیروز علی کربلائی کے فرزند اثر ترابی (وفات: ۳۱ اکتوبر ۲۰۰۸ء) اردو کے ممتاز مرثیہ نگار شاعروں میں شامل ہیں۔

۲۔ آغا مقصود مرزا

آپ کا تعلق الور سے تھا، مرحوم اپنی زندگی میں دہلی سے کراچی تک جس شہرت عام اور امتیاز کے مالک تھے اس کے پیش نظر ان کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ دہلی میں وہ درگاہ پنجہ شریف اور شیعہ یتیم خانے کے جنرل سیکریٹری رہے جبکہ پاکستان میں انھوں نے انجمن سوز خوانان پاکستان قائم کی اور اس کے بانی صدر کے طور پر خدمات انجام دی۔ آپ کا انتقال ۱۸ جولائی ۱۹۶۵ء کو ہوا۔

رضی حسن خان

رضی حسن خان آل انڈیا ریڈیو میں شعبہ موسیقی سے وابستہ تھے۔ وہ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے

تھے۔ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایک مصرع میں مختلف راگوں کا تاثر پیدا کرتے تھے جس سے مجلس کا رنگ دوبالا ہو جاتا تھا۔قیام پاکستان کے بعد انھوں نے کراچی میں سوزخوانی کی ترویج کے لیے اہم کردار ادا کیا۔رضی حسن خان کا انتقال ۱۹۷۳ء میں ہوا۔

۳۔سبطین احمد نقوی

مشہور مصور صادقین کے والد سبطین احمد نقوی ۱۸۹۱ء میں امروہا میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم امروہا میں ہی حاصل کی۔بچپن سے ہی شعر وشاعر سے شغف تھا اور اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے،تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا اور شجرات میں دسترس حاصل تھی۔کم عمری ہی سے سلام،مرثیہ گوئی اور رباعی میں طبع آزمائی کی۔محلہ بگلہ کے امام باڑے میں اپنے بزرگوں سے سوز خوانی اور مرثیہ خوانی سیکھی۔۱۹۴۸ء میں پاکستان ہجرت کی۔آپ کی وجہ شہرت سوزخوانی تھی۔جہلم کا تعزیہ جو پیر الٰہی بخش کالونی سے اٹھتا تھا،معروف مرثیہ ''قید سے چھوٹ کے جب سید سجاد آئے'' آپ ہی پڑھتے تھے۔سید متقی حسن اور دیگر آپ کے بازو ہوتے تھے۔یکم محرم ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۰ جنوری ۱۹۷۵ء کو کراچی میں وفات پائی۔

۴۔استاد معشوق علی خان

کلاسیکی موسیقی کے مشہور فنکار اور نامور سوزخواں استاد معشوق علی خان کا تعلق جے پور کے ایک موسیقی دان گھرانے سے تھا جہاں وہ ۱۹۰۵ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ان کے والد استاد عاشق علی خان بھی اپنے زمانے کے ایک نامور گایک تھے اور کلاسیکی موسیقی پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ استاد معشوق علی خان اور ان کے بھائی استاد اشتیاق علی خان خود بھی گایکی اور کلاسیکی موسیقی پر عبور رکھتے تھے مگر ان کی گایکی پر سوزخوانی کا رنگ اس قدر غالب تھا کہ وہ غزل اور کلام اقبال میں بھی سوزخوانی کے سر لگا جاتے تھے۔کراچی کے مشہور نوحہ خوان ناظم حسین (انجمن تبلیغ امامیہ کے صاحب بیاض) ان کے بھانجے تھے۔

استاد معشوق علی خان یکم جنوری ۱۹۷۷ء کو کراچی میں وفات پا گئے اور لیاقت آباد کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

۵۔ عزت لکھنوی

عزت لکھنوی ۱۹۳۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے، ۱۹۵۸ء میں وہ پاکستان آئے اور بینکنگ کے شعبے سے وابستہ ہوئے۔ آپ نے لکھنؤ ہی میں انجمن ظفر الایمان میں نوحہ خوانی شروع کردی تھی۔ پاکستان آنے کے بعد بھی وہ اسی انجمن سے بطور صاحب بیاض منسلک ہوئے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی سوزخوانی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ پاکستان ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والا ان کا مشہور سوز ''اب آئے ہو بابا'' ان کی شناخت بنا۔ یہ سوز جناب شاہد نقوی کا تحریر کردہ ہے۔

۱۶ جنوری ۱۹۸۱ء کو وہ اپنے بینک کے آڈٹ کے سلسلے میں خان پور گئے ہوئے تھے کہ حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے خالق حقیقی سے جا ملے۔

۶۔ آفتاب علی کاظمی

آفتاب علی کاظمی کا تعلق دہلی کے ایک صاحب علم گھرانے سے تھا۔ ۱۹۴۷ء میں وہ ہجرت کرکے پاکستان آگئے۔ وہ انجمن سوزخوانان پاکستان کے بانیوں میں شامل تھے اور ایک طویل عرصے تک اس کے سیکریٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ انجمن کے بانی صدر آغا مقصود مرزا کی وفات کے بعد وہ اس انجمن کے صدر مقرر ہوئے۔ انھوں نے کراچی میں نوجوان سوزخوانوں کی رہنمائی، تربیت اور حوصلہ افزائی کے لیے ایک اکیڈمی قائم کی جہاں وہ ہر ہفتے نوجوان سوزخوانوں کو تربیت دیا کرتے تھے۔ آفتاب علی کاظمی کے صاحبزادے سید علی نعمان کاظمی ایک عرصے سے ڈیلس ٹیکساس میں مقیم ہیں اور اپنے والد کی وراثت سنبھالے ہوئے ہیں۔ آفتاب علی کاظمی کا انتقال ۲۹ جون ۱۹۸۱ء کو ہوا اور نخی حسن کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

۷۔ عظیم الحسن

نامور سوزخوان عظیم الحسن کا تعلق سوزخوانی کے دبستان آگرہ و پھپرسرسے تھا۔ انھوں نے سوزخوانی کا فن جناب علی عابد صاحب سے سیکھا تھا۔ وہ روشن، پُردرد اور پرسوز آواز کے مالک تھے اور چند مخصوص بندشوں کے ایسے ماہر تھے جو صرف انھیں پر جچتی تھیں۔ وہ ہر لفظ کو اس کے استحقاق پر

موقع محل کی مناسبت سے ادا کرنے کی بھرپور قدرت رکھتے تھے اور سوز و سلام اور مرثیہ بڑی خوش اسلوبی سے پڑھا کرتے تھے۔

عظیم الحسن ۲۶ نومبر ۱۹۸۲ء کو خیر پور میں وفات پا گئے اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔

۸۔ بابا تقی

آپ کا پورا نام سید محمد تقی زیدی تھا اور آپ بابا تقی یا سائیں تقی کے نام سے معروف تھے۔ ریاست الور سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کا انتقال ۸۵ سال کی عمر میں ۱۹۸۳ء میں ہوا اور آپ مولٰی علی قدم، حیدر آباد سندھ میں آسودۂ خاک ہوئے۔ آپ کے صاحبزادے میر رضی میر بھی بہت اچھے سوز خوان، مرثیہ خوان اور مرثیہ نگار شاعر تھے۔

۹۔ مہدی ظہیر ضو کلیمی

مہدی ظہیر ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا اصل نام افتخار مہدی تھا۔ وہ اردو کے ساتھ ساتھ عربی پر بھی مکمل عبور رکھتے تھے۔ وہ ریڈیو پاکستان سے وابستہ تھے اور شاعری اور موسیقی دونوں فنون کے ماہر تھے۔ مہدی ظہیر شاعری میں ضو کلیمی تخلص کرتے تھے۔ ان کا انتقال ۱۵ اپریل ۱۹۸۸ء کو کراچی میں ہوا۔

۱۰۔ حاجی سید کفایت حسین رضوی

حاجی سید کفایت حسین رضوی آگرہ اور پھپھرسر کے دبستان کے سوز خوان تھے۔ ان کا انتقال ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۴ء کو ہوا۔

۱۱۔ دیوان جی امیر حسین

دیوان جی امیر حسین بھی ان سوز خوانوں میں شامل تھے جنھیں اپنی ذات میں انجمن کہا جا سکتا ہے۔ وہ بلند آواز اور انداز میں تن تنہا سوز خوانی کرتے تھے۔ ان کا شمار آگرہ کے معروف سوز خوانوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ان کا انتقال ۲۶ دسمبر ۱۹۹۴ء کو ہوا۔

۱۲۔ اختر وصی علی

اختر وصی علی کا تعلق محمود آباد سے تھا جہاں وہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے لکھنؤ کے چھوٹے امام باڑے سے سوز خوانی کا آغاز کیا۔ ۱۹۴۲ء میں انھوں نے ریڈیو حیدرآباد (دکن) میں ملازمت اختیار کی۔ قیام پاکستان کے بعد وہ پاکستان آگئے اور ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہوگئے۔ یہاں ان کی ملاقات نجن بیگم سے ہوئی جن کے ساتھ وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔ ۱۹۵۴ء میں جب پاکستان کا قومی ترانہ ریکارڈ ہوا تو ان کی آواز بھی اس ترانے کا حصہ بنی۔ انھوں نے موسیقی کی مزید تربیت استاد معشوق علی خان سے حاصل کی۔ اختر وصی علی خان کے آواز میں ریڈیو پاکستان کے بہت سے نغمات ریکارڈ ہوئے اور کئی نغمات میں ان کی آواز کورس میں شامل کی گئی۔ ستمبر ۱۹۷۰ء میں وہ ریڈیو پاکستان سے سبک دوش ہوگئے اور انھوں نے اپنی صلاحیتیں سوز خوانی کی فروغ کے لیے وقف کردیں۔ ان کی آواز میں استاد معشوق علی خان اور استاد بندو علی خان کا سوز نمایاں تھا۔ اختر وصی علی کا انتقال ۱۲ اگست ۱۹۹۵ء کو کراچی میں ہوا اور وہ سخی حسن کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔ مشہور گلوکارہ مہناز بیگم ان کی صاحبزادی تھیں۔

۱۳۔ حسن عابد جعفری

حسن عابد جعفری (پ: ۱۹۴۰ء) کے والد علی عابد صاحب اپنے زمانے کے معروف سوز خوان تھے۔ جن کے شاگردوں میں عظیم الحسن کا نام سرفہرست ہے۔ حسن عابد جعفری نے سوز خوانی کا آغاز عظیم الحسن کے بازو کے طور پر کیا تھا۔ ان کا انتقال ۲۲ ستمبر ۱۹۹۶ء کو ہوا اور وہ قبرستان انجمن حیدری محلہ علی مراد، خیر پور میرس میں آسودۂ خاک ہوئے۔

۱۴۔ استاد اشتیاق علی خان حیدری

آپ استاد معشوق علی خان کے چھوٹے بھائی تھے اور ۷ نومبر ۱۹۳۷ء کو پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے شاگردوں میں سید سبط جعفر زیدی کا نام سرفہرست ہے جنھیں آپ نے ۲۵ جنوری ۱۹۸۵ء کو ایک خصوصی تقریب میں اپنا بستہ تفویض کیا تھا۔ آپ کا انتقال ۲۹ مارچ ۱۹۹۷ء ہوا۔

۱۵۔ زوار حسین

ممتاز سوزخوان اور نوحہ خوان زوار حسین کا تعلق ریڈیو پاکستان سے تھا۔ انھوں نے فن موسیقی کی تربیت استاد لطافت خان سے حاصل کی تھی۔ انھیں یہ منفرد اعزاز حاصل ہے کہ ان کی آواز پاکستان کے قومی ترانے میں شامل ہے۔ زوار حسین نے ۷ جنوری ۱۹۹۸ء کو کراچی میں وفات پائی۔

۱۶۔ علی ناصر جعفری

علی ناصر جعفری کا تعلق سوزخوانی کے آگرہ و بہر سر دبستان سے تھا۔ ان کا انتقال ۲۳ جنوری ۱۹۹۹ء کو کراچی میں ہوا۔

۱۷۔ عاشق حسین کاظمی

عاشق حسین کاظمی لاہور کے نامور سوزخوانوں میں شامل تھے اور اپنے بھائیوں کے ساتھ کاظمی برادران کے نام سے سوزخوانی کرتے تھے۔ ان کا انتقال ۴ فروری ۱۹۹۹ء کو ہوا اور وہ مومن پورہ، لاہور کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

۱۸۔ مظاہر علی کاظمی

مظاہر علی کاظمی ۱۹۳۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں انھوں نے اپنے عزیز سید آفتاب علی کاظمی کے بازو اور شاگرد کے طور پر سوزخوانی کا آغاز کیا اور تاحیات ان سے منسلک رہے۔ ۱۹۶۷ء میں آفتاب علی کاظمی کی علالت کے بعد انفرادی طور پر بھی مجالس عزا ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگراموں میں سوزخوانی شروع کی۔ آپ کے بازوؤں میں آپ کے چھوٹے بھائی سید برکت علی کاظمی اور پسران سید مرتضی علی کاظمی، سید معظم علی کاظمی اور سید جعفر علی کاظمی کے نام شامل ہیں۔ آپ کے شاگردوں میں جاوید برادران بھی شامل ہیں جو کراچی کے ممتاز سوزخوان ہیں۔

مظاہر علی کاظمی ۷ برس تک انجمن سوزخوانان پاکستان کے صدر رہے۔ وہ ہر سال سہون میں حضرت لعل شہباز قلندر کے مزار پر حاضری دیا کرتے تھے جہاں ۲۹ اکتوبر ۲۰۰۲ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ وہ کراچی میں علی باغ کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔

۱۹۔ حکیم محمد کاظم حسین زیدی

حکیم محمد کاظم حسین زیدی کراچی کے مشہور سوز خوانوں میں شامل تھے۔ ان کا انتقال ۲۰۰۲ء میں ہوا۔

۲۰۔ استاد واحد حسین خان

استاد واحد حسین کا تعلق خورجہ سے تھا اور آپ حنفی العقیدہ تھے۔ وہ ۱۹۲۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد استاد الطاف حسین خان صاحب نے، جو خود بھی اپنے زمانے کے مشہور موسیقار تھے، انھیں موسیقی کی اعلیٰ تربیت دی۔ انھیں اپنے بھائیوں استاد عظمت حسین خان اور استاد ولایت حسین خان صاحب کے ساتھ موسیقی کی متعدد کانفرنسوں میں شرکت کا موقع ملا۔ ۱۹۶۴ء میں اپنے والد کی وفات کے بعد وہ اپنے بھائی استاد ممتاز حسین خان کے ساتھ کراچی آگئے۔ آپ سوز خوانی کے علاوہ قوالی کے فن پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ آپ کی سوز خوانی میں الور اور دہلی گھرانے کی جھلک ملتی تھی۔ آپ کا انتقال ۱۹ نومبر ۲۰۰۴ء کو ہوا۔

۲۱۔ میر رضی میر

مشہور مرثیہ نگار، مرثیہ خواں اور سوز خواں میر رضی میر ۱۶ اگست ۱۹۱۷ء کو راجپوتانہ کی ریاست الور کے ایک قصبے کھیرتل میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید محمد تقی عرف بابا تقی یا سائیں تقی بھی اپنے عہد کے معروف سوز خوان تھے۔ میر رضی میر نے یہ فن اپنے والد سے سیکھا۔ وہ شاعری میں نسیم امروہوی کے شاگرد تھے اور سلام، قصیدہ، رباعی، نوحہ اور مرثیہ ہر صنف سخن پر دسترس رکھتے تھے۔ میر رضی میر کا انتقال ۱۴ اپریل ۲۰۰۵ء کو ہوا۔

۲۲۔ محسن حسین نقوی

محسن حسین نقوی عرف محسن امروہوی نے سوز خوانی کا آغاز آباد محمد نقوی زائر کے بازو کے طور پر کیا تھا۔ ان کا انتقال ۱۴ اپریل ۲۰۰۶ء کو ہوا۔

۲۳۔ افتخار علی عرف پیارے خان

افتخار علی عرف پیارے خان لاہور کے مشہور سوز خوانوں میں شامل تھے۔ ان کا انتقال ۴ فروری ۲۰۰۷ء کو ہوا اور وہ لاہور میں مومن پورہ کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

۲۴۔ آباد محمد نقوی زائر

پاکستان کے نامور سوز خواں اور شاعر سید آباد محمد نقوی زائر ۹ مارچ ۱۹۲۴ء کو امروہا میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۶۸ء میں انھوں نے حضرت نسیم امروہوی کے سامنے شرف تلمذ کیا اور مرثیہ نگاری کا آغاز کیا۔ وہ پاکستان کے چند بڑے سوز خوانوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا تعلق اگرچہ دبستان امروہا سے تھا مگر انھوں نے دوسرے دبستانوں کے اثرات بھی قبول کئے اور اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق بھی سوز خوانی میں اختراعات اور ایجادات کیں۔ وہ ایک اچھے شاعر تھے اور انھوں نے سوز خوانی کے مزاج کے مطابق بہت اچھی رباعیات اور قطعات موزوں کئے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے نچلے سروں میں آہستگی، متانت اور سبک روی کے ساتھ سوز خوانی کرتے تھے۔ وہ ایک طویل عرصہ تک انجمن سوز خوانان پاکستان کے صدر اور سالانہ مجلس سوز خوانی کے ناظم بھی رہے تھے۔

سید آباد محمد نقوی زائر امروہوی ۱۱ مئی ۲۰۰۷ء کو کراچی میں وفات پاگئے اور کراچی ہی میں بہشت زہرا کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

۲۵۔ تنویر حسنین جعفری

تنویر حسنین جعفری کراچی کے معروف سوز خوانوں میں شامل تھے۔ ان کا انتقال ۹ نومبر ۲۰۰۷ء کو ہوا۔

۲۶۔ خادم علی پاڑو بھائی

خادم علی پاڑو بھائی کا تعلق حیدرآباد (دکن) سے تھا۔ وہ ان معروف سوز خوانوں میں شامل تھے جو خدمت اہل بیت کے تعلق سے معروف ہوئے۔ خادم علی پاڑو بھائی کا انتقال ۵ دسمبر ۲۰۰۷ء کو کراچی میں ہوا۔

۲۷۔ علی اوسط زیدی

پاکستان کے نامور سوزخواں علی اوسط زیدی ۱۹۳۲ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے سوزخوانی کی تربیت اپنے نانا سید محمد جان سے حاصل کی جو اپنے زمانے کے معروف سوزخواں تھے۔ ۱۹۴۸ء میں وہ پاکستان آ گئے۔ ابتدا میں وہ نوحہ خوانی بھی کرتے تھے مگر پھر علامہ رشید ترابی کے مشورے پر انھوں نے خود کو سوزخوانی کے لئے وقف کر دیا۔ وہ ۱۹۵۸ء سے ۲۰۰۸ء تک مسلسل ۵۰ برس کراچی کی مرکزی مجالس عزا میں سوزخوانی کرتے رہے۔ سید علی اوسط زیدی کا انتقال ۲۱ اکتوبر ۲۰۰۸ء کو کراچی میں ہوا۔

۲۸۔ ظہور جارچوی

ظہور جارچوی کا اصل نام ظہور حیدر تھا اور وہ ۱۴ مئی ۱۹۱۲ء کو جارچہ ضلع بلند شہر یو پی میں پیدا ہوئے۔ ظہور جارچوی نے سوزخوانی کا فن اپنے والد میر عیوض علی سے سیکھا اور شاعری میں اطہر لکھنوی اور صفی لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ لاہور میں قیام پذیر ہوئے۔ انھوں نے سوزخوانی کے لیے ۲۴ مرثیوں کا ایک مجموعہ ''شعور سوز مرثیہ'' کے نام سے مرتب کیا۔ اس کے علاوہ بھی ان کے رثائی کلام کے کئی مجموعے بھی شائع ہوئے جن میں ظہور فکر ،تحائف ظہور، جوش ظہور، محروم گریہ، سلام علی علی الحسین واصحابہ اور نذر منتظر کے نام سرفہرست ہیں۔ ظہور جارچوی کا انتقال ۷ دسمبر ۲۰۰۸ء کو ہوا اور وہ لاہور میں مومن پورہ کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

۲۹۔ سبط جعفر زیدی

سید سبط جعفر زیدی ۷ مارچ ۱۹۵۷ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے نہایت کم عمری میں مجالس عزا میں پیش خوانی سے شہرت حاصل کی۔ استاد معشوق علی خان سے سوزخوانی کی تربیت حاصل کی اور بہت جلد پاکستان کے معروف سوزخوانوں میں شمار ہونے لگے۔

سبط جعفر زیدی نے بستہ کے عنوان سے سوزخوانی میں پڑھے جانے والے کلام کو مرتب کیا اور صوتی علوم وفنون اسلامی کے نام سے ایک کتاب تحریر کی جس میں سوزخوانی کے ساتھ ساتھ ان

تمام علوم کا بھی جائزہ لیا گیا تھا جن کا تعلق لحن سے ہے۔

۱۸ مارچ ۲۰۱۳ء کو کراچی میں دہشت گردوں نے انھیں شہید کر دیا۔ وہ وادیِ حسین کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔ (باقی صفحہ نمبر ۱۱۷)

۳۰۔ شیدا حسن زیدی

۳ جولائی ۱۹۳۲ء کو مظفر نگر، سادات بارہہ میں پیدا ہوئے، ۱۹۵۰ء میں پاکستان آ گئے۔ ان کے دادا سید ابن حسن تحت اللفظ مرثیہ پڑھا کرتے تھے جبکہ دادا کے چھوٹے بھائی سید نظیر حسن سوز خوانی سے لگاؤ رکھتے تھے۔ شیدا حسن زیدی کے والد سید ظہور حسن نے انھی سے سوز خوانی سیکھی۔

شیدا حسن زیدی اپنے کتب خانے کے تعلق سے بھی معروف تھے جہاں رثائی ادب کا ایک بڑا ذخیرہ محفوظ تھا۔ انھوں نے ۱۵ اپریل ۲۰۱۴ء کو کراچی میں وفات پائی۔

۳۱۔ سید محمد زاہد نقوی

سید محمد زاہد نقوی ۱۹۳۴ء میں مصطفیٰ آباد ضلع رائے بریلی (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ سوز خوانی اور تحت اللفظ مرثیہ خوانی کے اسرار و رموز مقصود حسین، یعقوب حسین (اکی میاں) اور چھنگی میاں سے سیکھے۔ ریڈیو پاکستان سے وابستگی اور کلاسیکی موسیقی میں خدمت کے سبب اپنا الگ انداز اپنایا۔ تحت اللفظ خوانی میں بھی اپنا منفرد مقام رکھتے تھے۔ ۱۶ دسمبر ۲۰۱۵ء کو کراچی میں وفات پائی اور یحییٰ حسن کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

۳۲۔ نظام حیدر نقوی

نظام حیدر نقوی کا تعلق فتح پور ہسوہ کی ایک بستی پٹی سادات سے تھا، وہ ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے، ان کے دادا اور والد اپنے زمانے کے مشہور سوز خوانوں میں شامل تھے۔ نظام حیدر نقوی نے سوز خوانی کا فن انھی سے سیکھا۔ ۱۹۴۵ء میں وہ پاکستان آ گئے۔ وہ انجمن عابدیہ کاظمیہ سے بھی وابستہ رہے اور ۱۱ برس تک استاد صادق حسین (چھجن صاحب) کے بازو رہے۔ ۱۹۶۵ء کے بعد انھوں نے اپنی صلاحیتیں مکمل طور پر سوز خوانی کے وقف کر دیں۔ ۹ مارچ ۲۰۱۹ء کو کراچی میں وفات پائی۔

۳۳۔ڈاکٹر محتشم نقوی

ڈاکٹر محتشم نقوی مشہور شاعر سالک نقوی کے صاحبزادے تھے۔ ۱۹۳۲ء کے لگ بھگ شکار پور (بلند شہر) میں پیدا ہوئے۔ تعلیمی مدارج حیدرآباد (دکن) میں طے کیے جہاں وہ علامہ عقیل ترابی کے ہم جماعت تھے۔ ۱۹۴۸ء میں پاکستان تشریف لائے۔ ۱۹۷۵ء میں باقاعدہ سوز خوانی کا آغاز کیا۔ وہ فیروز کربلائی اور عظیم الحسن کے انداز سوز خوانی سے بہت متاثر تھے۔ نیو رضویہ سوسائٹی کراچی میں عزاخانہ سکینہ کی بنیاد رکھی۔ یکم نومبر ۲۰۱۹ء کو وفات پائی۔ اب ان کی وراثت ان کے صاحبزادے علی اکبر نقوی نے سنبھالی ہوئی ہے۔

۳۴۔فائق حسین رضوی

استاد فائق حسین رضوی یکم مئی ۱۹۳۹ء کو شاہ گنج آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی سوز خوانی کا آغاز ۱۹۵۵ء میں ہوا۔ ابتدا میں عظیم الحسن اور پھر آفتاب علی کاظمی کے ساتھ بطور بازو سوز خوانی کی۔ ۲۰۰۳ء میں انجمن سوزخوانان پاکستان کے صدر کا منصب سنبھالا جس پر وہ اپنی وفات تک قائم رہے۔

استاد فائق حسین رضوی نے اپنے برادران اور پسران کو سوز خوانی کے لیے باقاعدہ تیار کیا۔ آپ کے صاحبزادے محمد عباس رضوی خود بھی ایک پختہ کار سوز خوان ہیں جو اپنے چچا جناب نواب جعفر رضا، جناب نور رضا اور جناب رضا پنجتن کے ساتھ خدمت اہل بیت میں مصروف ہیں۔

استاد فائق حسین رضوی نے ۹ جون ۲۰۲۰ء کو کراچی میں وفات پائی اور جنت البقیع کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

۳۵۔حشمت علی زیدی

حشمت علی زیدی ۱۹۴۰ء میں جانسٹھ ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے استاد ابوالحسن سے سوز خوانی کے اسرار رموز سیکھے اور ۱۹۶۰ء کی دہائی میں سوز خوانی کا آغاز کیا۔ ان کے ابتدائی بازوؤں میں محمد مونس، حیدر حسین، وصی حیدر اور ظہور علی شامل تھے۔ ۱۱۵گست ۲۰۲۰ء کو کراچی میں وفات پائی اور وادیٔ حسین کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

نواں باب

پاکستان میں سوزخوانی کے چند دبستان

۱۹۴۲ء میں محمد علی خان نے حیدرآباد (دکن) کے سوزخوانوں کے حالات پر مبنی ایک تذکرہ ''تذکرۂ ذاکرین'' کے نام سے مرتب کیا جس کا تعارف علامہ رشید ترابی نے تحریر فرمایا تھا۔ اسی طرح حیدرآباد (دکن) ہی سے سید تقی حسن وفا کی ادارت میں شائع ہونے والے جریدے صدائے جعفریہ کے عزاداری نمبر میں صمصام علی گوہر کا ایک مضمون حیدرآباد (دکن) کی مرثیہ خوانی شائع ہوا۔ ان دونوں تحریروں میں حیدرآباد (دکن) سے تعلق رکھنے والے سوزخوانوں کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ اسی طرح پروفیسر منظور حسنین آرزو نے اپنی کتاب ''عزاداری امروہا، ہمارا مذہبی ورثہ'' میں امروہا کی سوزخوانی کے بارے میں ایک باب مختص کیا۔ لکھنؤ کے بیشتر سوزخوانوں کے حالات ڈاکٹر سید سکندر آغا کی کتاب ''سوزخوانی تاریخ و تذکرہ'' میں محفوظ ہو گئے تاہم اب بھی اس امر کی ضرورت ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے مختلف علاقوں کی سوزخوانی اور سوزخوانوں کے حالات تفصیل کے ساتھ تحریر کیے جائیں۔ اس سلسلے میں سید سبط جعفر زیدی کی کاوش قابل قدر ہے جو انھوں نے اپنی کتاب ''صوتی علوم و فنون اسلامی'' میں محفوظ کی ہے۔ اس کتاب میں شامل اپنے مضمون سوزخوانی میں انھوں نے سوزخوانی اور سوزخوانوں کے چند مشہور و نمائندہ دبستان (بستے) کے عنوان سے لکھا ہے کہ:

''یوں تو حیدرآباد دکن، بہار، یوپی، سی پی، راجستھان و پنجاب غرض یہ کہ ہر جگہ ہی سوزخوانوں کا وجود اور تذکرہ ملتا ہے مگر راجستھان میں الور، جے پور، پھر راجستھان اور یوپی کے سرحدی علاقہ آگرہ، پیہر سر، بھرت پور وغیرہ، امروہا، بجنور و سادات بارہہ، دہلی اور بالخصوص لکھنؤ اور مضافات یعنی اودھ (بشمول محمود آباد) کی سوزخوانی اپنا جداگانہ تشخص و امتیاز رکھتی ہے اور اس

کے باقاعدہ دبستان اور گھرانے مشہور ہیں۔ یہ وہ دبستان ہیں کہ جو پاکستان میں بھی قائم اور سرگرم عمل ہیں۔ عزاداری و سوز خوانی کی اصطلاح میں دبستان یا گھرانہ کو بستہ کہا جاتا ہے"۔ یہ مضمون اپنی افادیت کے پیش نظر معمولی سی قطع و برید کے ساتھ اس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔

لکھنؤ، محمود آباد اور گرد و پیش (اودھ) کا دبستان:

سوز خوانی کا مرکز و محور اور مخزن و منبع اسی سرزمین کو قرار دیا جاتا ہے بلکہ عزاداری اور اس کی تمام متعلقات کا اہتمام مختلف مراسم کا آغاز یہیں سے ہوا جس میں سوز خوانی بھی شامل ہے۔ نادر صاحب، سجاد صاحب، منجھو صاحب اور دوسری نامور شخصیات کے اسمائے گرامی سوز خوانی کے بانیان و ابتدائی خدام و ماہرین کے طور پر لیے جاتے ہیں۔ انھیں میں ایک خانوادہ محترمہ کجن بیگم اور اختر وصی علی صاحب کا بھی ہے۔ کجن بیگم صاحبہ ماہرۂ فن ہیں موسیقی و عزاداری پر عبور اور دستگاہ رکھتی تھیں۔ آواز و ریاض اور سوز دل کی دولت سے مالا مال ہیں خاندان کی دوسری مستورات آپ کی بازو ہوتی تھیں جبکہ اختر وصی علی صاحب بھی خوش گلو مہذب و نستعلیق انسان اور عزاداری کی تکنیکی ضروریات اور نزاکتوں سے باخبر تھے اور اپنی صلاحیتیں خوب خوب بروئے کار لاتے تھے۔ مجلس سوز خوانی اور انجمن سوز خوانان کے بانی اراکین میں آپ کا بھی شمار ہوتا تھا۔ آپ کے بستہ میں متعدد قطعات و رباعیات اور سوز کی طبع زاد اور خاندانی بندشیں تھیں۔ جنھیں بڑے اہتمام سے پڑھتے تھے۔ سلام کی طرز بھی بڑی خوب صورت، بکمل ایسی چست ہوتی تھی کہ ہر شخص اس کی نقل نہیں کر سکتا۔ مرثیہ کی بھی مختلف طرزوں کو بڑی مہارت اور خلوص سے ادا کرتے ہیں ہر قسم کا کلام شایان شان بندشوں میں ادا کرنے کی قدرت رکھتے تھے، انتخاب کلام میں بھی احتیاط کا مظاہرہ کرتے تھے۔ بازوؤں میں راحت علی صاحب خود بھی اچھے سوز خواں ہیں جبکہ خورشید حیدر نقوی صاحب بھی آپ کے قدیم ساتھی اور اچھے بازو تھے۔

اگرچہ ان کا خاندان دوسرا ہی ہے مگر دبستان تقریباً یہی ہے۔ میری مراد ہیں زوار حسین صاحب، جو لکھنؤ سے متعلق اور سنجیدہ و مہذب انسان ہیں موسیقی و عزاداری دونوں ہی کو سمجھتے اور برتتے تھے۔ اگرچہ باقاعدہ و مستقل طور پر بازوؤں، بیاض، بستہ اور مرثیہ وغیرہ کا اہتمام و انتظام نہیں رکھتے مگر ماہر فن سوز خواں تھے۔ متعدد قطعات و رباعیات اور سوز بڑے نپے تلے انداز اور

سریلی آواز و چست خوب صورت بندشوں میں بڑی مہارت سے ادا کرتے تھے۔ سلام اور مرثیہ بھی اچھا پڑھتے تھے۔ آواز اگرچہ چھوٹی مگر سریلی اور میٹھی تھی اور اس سے کام لینا بھی خوب جانتے تھے۔ ان کی اہلیہ بھی اچھی سوز خواں تھیں۔ اختر وصی علی صاحب کی طرح یہ بھی نوحہ خوانی و سوز خوانی کے لیے بندشیں مرتب کرتے رہے ہیں۔

دبستان لکھنؤ کے سوز خواں قطعات و رباعیات اور سوز میں آس کے ساتھ کلام پڑھتے ہیں یعنی سوز خواں (سرِ) کلام ادا کرتا ہے اور بازو آس دیتے رہتے ہیں۔ سلام میں حسب موقع بازو ساتھ بھی دلواتے ہیں اور آس بھی جبکہ مرثیہ میں سب ساتھ مل کر کلام ادا کرتے ہیں اور سوز خوانی کا معروف طریقہ یہی ہے الور اور دہلی کے بیشتر گھرانے حتیٰ کہ آگرہ و پیر سر والے بھی اسی کی تقلید کرتے ہیں۔ جبکہ سادات بارہہ اور بعض دوسری بستیوں بشمول دکن، امروہا، بہار وغیرہ کا طریقہ کار اس سے مختلف ہے۔ جہاں آس دیتے رہنے کا تصور نہیں ہے بلکہ بازو بھی سوز سے مرثیہ تک ہمہ وقت ساتھ ہی کلام کی ادائی کرتے ہیں۔ خواتین کی سوز خوانی خواہ کسی بھی علاقہ، خطہ اور بستے (دبستان) کی ہو اس کا بھی یہی طریقہ ہے۔ گویا آس دیتے رہنے کا طریقہ خالص مردانہ اور لکھنؤ کے علاوہ الور کے گھرانوں سے مخصوص و متعلق ہے اگرچہ بعض دوسرے علاقوں کے سوز خوان بھی اس کی تقلید کرتے رہے ہیں جن میں عظیم الحسن مرحوم (آگرہ و پیر سر)، آفتاب علی کاظمی مرحوم (دہلی) اور آباد محمد نقوی زائرؔ (امروہا) کے علاوہ استاد واحد حسین، صابرہ کاظمی، کوکب رضوی خاندان، انیس فاطمہ اور برجیس نقوی و آداب زہرا (مونا، بیگم سید عاقل حسین) بھی اسی فہرست میں آتی ہیں۔

دبستانِ دہلوی:

چونکہ دہلی کا کوئی مخصوص و متعین دبستان یا طرز ادائی نہیں ہے اس لیے میں نے اسے دبستان دہلوی کا نام دیا ہے (بجائے دبستان دہلی کے) دہلی میں یوں تو دوسرے خاندان اور گھرانے بھی سوز خوانی کرتے رہے ہیں جن میں استاد عبدالکریم خاں صبر اور ان کے صاحب زادہ افتخار احمد کے علاوہ فاروق نظامی بھی شامل ہیں۔ لیکن دو خاندان ایسے ممتاز و منفرد اور نمایاں ہیں کہ جہاں مشخص قسم کی ادائی مخصوص بندشیں اور سوز خوانوں کا تسلسل اور باقاعدہ بستہ موجود ہے۔ ان خاندانوں میں نہ صرف بزرگ اور نوجوان ہی بلکہ خواتین بھی سوز خوانی کرتی ہیں۔ ان میں ایک

خانوادۂ مقصود مرزا ہے۔ آغا مقصود مرزا بڑے پُر رعب، صاحب اثر و رسوخ مگر عزاداری اور عزاداروں کے لیے اتنے ہی مخلص اور سراپا انکسار تھے۔ نہ صرف سوزخوان ہی اچھے تھے بلکہ منتظم بھی اعلیٰ درجہ کے تھے۔ کراچی میں بھی مجلس سوزخوانی اور انجمن سوزخوانان کے قیام واستحکام میں آپ نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ آپ کے صاحبزادگان آغا مسعود مرزا اور آغا داؤد مرزا کے بعد ان کے دوسرے اہل خانہ خصوصاً آغا مہدی مسعود اور دختران و متعلقین آغا مقصود مرزا اس سلسلہ کو روایتی انداز میں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ پاٹ دار آواز، اونچے نیچے سُر، بھرپور آواز و انداز میں ہر قسم کا کلام بڑے رعب و دبدبہ سے ادا کرتے ہیں۔ سارے ساتھی ہمہ وقت یک آواز ہو کر کلام ادا کرتے ہیں۔ آس کا کوئی جداگانہ یا مستقل و مسلسل تصور اس طرز ادائی اور دبستان میں موجود نہیں۔ بہرحال یہ خانوادہ قیام پاکستان سے اب تک بحمد للہ تسلسل و تواتر سے عزاداری و سوزخوانی کے لیے گراں قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔

اسی دبستان کے متوازی ایک اور خاندان بھی عزاداری و سوزخوانی کے لیے قیام پاکستان ہی سے سرگرم عمل ہے اور بحمد للہ یہ تسلسل اب بھی جاری ہے اس کے نمائندہ تھے، جناب آفتاب علی کاظمی جو ایک خلیق اور ضعدار انسان اور صاحب کمال سوزخوان تھے۔ عزاداری کے تقاضوں اور فنی نزاکتوں کو بھی اچھی طرح جانتے اور برتتے تھے۔ آپ کی ان تھک محنت کے نتیجہ میں کراچی میں سوزخوانی کو فروغ و مقبولیت حاصل ہوا۔ میٹھے ٹھنڈے سُروں میں دھیمے لہجے اور ٹھہراؤ کے ساتھ آپ سوزخوانی کیا کرتے تھے۔ خاندان کے دوسرے افراد آپ کے بازو اور ساتھی ہوا کرتے تھے۔ سوز و رباعیات و قطعات اور سلام کی بعض بندشیں بڑی پُر اثر اور پُر سوز تھیں۔ اس خانوادہ کی مستورات بھی اس فریضہ اور ورثہ کو سنبھالے ہوئے ہیں جبکہ مردوں میں اس طرز ادائی کی نمائندگی ان کے عزیز اور بازو مظاہر علی کاظمی صاحب کرتے تھے۔ اب ان کے برادران و پسران اس بستہ اور دبستان کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ مظاہر کاظمی نہ صرف اس بستہ کی چیزیں ہی پڑھتے تھے بلکہ خود بھی اپنے مزاج کے مطابق اضافہ کرتے رہتے تھے۔ آفتاب علی کاظمی صاحب کے اہل خانہ اور دوسرے اعزا کے علاوہ فائق حسین رضوی صاحب بھی اس بستہ سے متاثر اور کسی حد تک متعلق بھی تھے جن کی ادائی میں دہلی کے علاوہ آگرہ پھپھرسر اور خود اپنے مزاج کی سوزخوانی بھی شامل تھی۔ آفتاب کاظمی و مظاہر کاظمی صاحبان بھی اگرچہ ہر سوز میں آس نہیں لیا کرتے تھے مگر یہ کسی بھی سوز میں آس نہیں لیتے۔

دبستان آگرہ وپیہر سر:

یہ بھی کوئی مخصوص ومتعین دبستان نہیں ہے تاہم مختلف صاحب طرز ومنفرد گھرانے اس علاقہ کی پہچان ہیں جن میں سرفہرست نام عظیم الحسن مرحوم کا ہے۔ عظیم الحسن صاحب ایک نفیس اور نستعلیق تھے اور روشن پر دردو پر سوز آواز وانداز کے مالک تھے چند مخصوص انگ رنگ کی بندشوں کے ایسے ماہر تھے کہ جو صرف انھیں پر جچتی کھپتی تھیں۔ لفظ کو اس کے استحقاق پر اور ضرورت اور موقع محل کی مناسبت سے ادا کرنے کی قدرت وصلاحیت رکھتے تھے۔ سوز وسلام اور مرثیہ ہر چیز خوب خوب پڑھا کرتے تھے۔ بازو بھی رکھتے تھے۔ جن میں صفدر کاظمی اور حسن عابد جعفری صاحبان خود بھی اچھے سوزخوان تھے۔ ان کی صاحبزادیاں اور نواسیاں بھی اچھی سوزخواں ہیں اور اپنے خاندانی بستہ اور ورثہ کو کسی قدر سنبھالے ہوئے ہیں۔ عظیم الحسن صاحب اگرچہ بازوؤں کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ مگر بوقت ضرورت تنہا بھی مکمل سوزخوانی کرلیا کرتے تھے۔

آگرہ ہی کے معروف عالم دین اور شاعر وادیب مولانا سید شہنشاہ حسین رضوی شفق اکبر آبادی صاحب بھی اپنے وطن اور ماحول کے ایک نمائندہ سوزخواں اور نوحہ خواں تھے اگرچہ ان کی وجہ شہرت شاعری وذاکری اور تلاوت حدیث کساء رہی ہے۔ اس دبستان کا تسلسل تو نہیں مگر کسی حد تک ہم رنگ اور ہم عصر سوزخواں سید امیر حسن (المعروف بہ دیوان جی) تھے جو تنہا ہی مکمل سوز خوان اور ٹیم دکھائی دیتے تھے۔ اپنی عمر کے آخری حصہ اور کبرسنی میں بھی بلند آواز وانداز میں بھرپور سوزخوانی کرتے رہے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے وطن مالوف ہی کا رنگ نبھایا بلکہ اپنے معاصرین سے بھی استفادہ کیا اور اثرات قبول کیے۔ تیور اور پنچم سروں (کدارا وغیرہ) میں آپ تن تنہا بھی مکمل سوزخوان رہے ہیں۔ اگرچہ انھیں کوئی دبستان نہیں قرار دیا جاسکتا نہ ہی کوئی خاندان بازو یا آثار چھوڑے ہیں پھر بھی آپ کے اثرات سامعین پر تادیر قائم رہیں گے۔ اسی تسلسل میں ڈاکٹر علی اوسط رضوی اور حسن رضا برادران بھی آتے ہیں۔ کوئی مشخص ومتعین طرز ادائی یا دبستان نہ ہونے کے باوجود بھی اسی علاقہ کے اثرات کی وجہ سے یہ حضرات دبستان آگرہ وپیہر سر میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً حاجی سید کفایت حسین، حسن عابد جعفری، ذوالفقار جعفری، ذرحسن جعفری، رضا علی جعفری، محمد احمد جعفری، حاجی فائق حسین رضوی برادران وپسران اوران حضرات کے

متعلقین۔ انھیں خاندانوں کی خواتین بھی بڑی باقاعدگی سے سوز خوانی کرتی ہیں۔ یہ حضرات اپنے علاقائی روایتی خاندانی انداز و ادائی کے ساتھ معاصرین دوسرے مکاتب یعنی گھرانوں اور سوز خوانوں سے بھی استفادہ کرتے رہے اور ان کے اثرات قبول کرتے رہے ہیں۔ سوز و رباعیات تو ان کے زیادہ متاثر کن نہیں ہوتے تاہم سلام اور خصوصاً مرثیہ کی ادائی کما حقہ، اور رقت انگیز کرتے ہیں۔ اس دبستان کے سوز خوان آس نہیں لیتے بلکہ سارے افراد ہمہ وقت سارا کلام ساتھ رہتے ہیں۔ اس علاقہ سے تعلق رکھنے کی بنا پر یہاں کی روایتی سوز خوانی علی ناصر جعفری صاحب و تنویر بیانوی صاحب بھی کرتے ہیں۔ مگر وہ دبستان الور سے زیادہ متاثر ہیں۔ بزرگ سوز خواں نبی احمد نقوی بھی اسی دبستان سے متاثر نظر آتے ہیں۔

امروہا، بارہہ، بجنور، رام پور، بریلی اور مضافات

اگرچہ مشرقی پنجاب، سہارن پور، بجنور، سادات بارہہ (ضلع مظفر نگر) میرٹھ، امروہا (ضلع مراد آباد) رام پور، بریلی اور متصل علاقوں میں بھی سوز خوانی ہوتی رہی ہے اور بڑے بڑے نامور سوز خواں ان علاقوں سے ہوئے ہیں۔ مگر کوئی مخصوص و متعین دبستان کی شکل میں قائم نہ ہوسکا۔ گویا انفرادی شخصیات اور ان کے متعلقین، بعض برادریوں اور خاندانوں میں سوز خوانی ہوتی رہی ہے۔ جن کے افراد اپنے خاندان، ماحول اور معاصر سوز خوانوں سے اور دوسرے دبستانوں سے متاثر ہو کر سوز خوانی کرتے رہے یہ بھی ہوا کہ کوئی شخص یا خوش گلو عزادار یا سوز خواں و نوحہ خواں بغرض معاش یا عزاداری کے لیے دوسرے علاقوں میں مثلاً آگرہ، لکھنؤ، دہلی یا رام پور وغیرہ گیا اور وہاں کے اساتذہ اور سوز خوانوں کے زیر اثر اور کچھ اپنے ماحول و مزاج کی آمیزش سے سوز خوانی کرنے لگا اور اس امتزاج سے ایک نیا طرز اور انداز وجود میں آیا جو اس کی شناخت و امتیاز اور انفرادیت قرار پایا اور ان کے متعلقین نے جب اسے تسلسل و تواتر عطا کیا تو یہ بھی ایک ذیلی و ضمنی دبستان بن گیا جسے وقتی طور پر پذیرائی بھی حاصل ہوئی اور روایت پسند مقامی سوز خوانوں یا عزاداروں کی طرف سے تنقید کا سامنا کرنا پڑا کہ اسے خاندانی و مقامی روایات سے اختلاف و انحراف بھی قرار دیا گیا۔ اس قسم کے سوز خوانوں میں سہارنپور کے حافظ سید محمد امیر زیدی صاحب (قمر سہارنپوری کے والد) بھی شامل ہیں اور امروہا کے سبطین نقوی صاحب (مصور صادقین کے

والد) بھی کہ جو اگرچہ مقامی روایات سے تضاد و اختلاف نہیں رکھتے تھے۔ مگر انھوں نے اپنی ایجادات واختراعات سے اپنا جداگانہ تشخص قائم کیا۔ بوجوہ یہ طرز اور سلسلہ جاری نہ رہ سکا تاہم قیام پاکستان کے بعد ابتدائی ربع صدی میں کراچی کی عزاداری میں انھیں اہم مقام حاصل رہا جبکہ یہ ایسا زریں عہد سوزخوانی تھا کہ جس میں دنیائے سوزخوانی کے تمام نامور دبستانوں کے نمائندہ مشاہیر سوزخواں بھرپور خدمات انجام دے رہے تھے۔ آغا مقصود مرزا صاحب، آفتاب علی کاظمی صاحب، اختر وصی علی صاحب، استاد معشوق علی خان صاحب، حشمت حسین زیدی صاحب، عظیم الحسن صاحب اور آباد محمد نقوی زائر امروہوی صاحب وغیرہم۔ ان حضرات کی موجودگی میں اپنی جگہ بنانا اور منوانا یقیناً قابل ذکر بات ہے۔ سبطین نقوی صاحب اگرچہ امروہا کے منفرد و نمائندہ سوزخواں تھے مگر خالص امروہوی سوزخوانی وہ بھی کہ جس کا مظاہرہ حضور الحسن و تقی الحسن صاحبان کرتے رہے ہیں۔ اس اعتبار سے آباد محمد نقوی صاحب بھی اگرچہ امروہا سے تعلق رکھنے کی بنا پر امروہوی طرز سوزخوانی سے آگاہی رکھتے تھے مگر وہ اپنے معاصرین اور خود اپنی طبیعت و مزاج کے زیر اثر سوزخوانی کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی طبیعت کے اور مزاج کے مطابق و موافق دوسرے اساتذہ کے بھی اثرات قبول کیے اور اپنی اختراعات و ایجادات سے بھی سوزخوانی کو فروغ دیا۔ دھیمے دھیمے نچلے میٹھے سروں میں آہستگی متانت اور سبک روی کے ساتھ (زیادہ تر نکھاد کے استعمال پر توجہ دیتے ہوئے) سوزخوانی کرتے ہیں۔ بعض سوز بشمول رباعیات و قطعات بہت اچھے موزوں کیے ہیں۔ مخصوص انداز اور اپنے مزاج کی بندشیں بھی اچھی مرتب کرتے ہیں۔ بالعموم سوز و سلام میں اپنا ہی کلام پڑھتے ہیں۔ مرثیہ کی بعض بندشیں بھی متاثر کن ہیں۔ باقاعدہ دبستان تو نہیں قائم کر سکے نہ ہی مستقل سلسلہ قائم کیا مگر صاحبزادگان دو تین باز و اور صاحبزادیاں بہرحال آپ سے وابستہ ہیں۔ امروہا سے متعلق دوسرے سوزخوانوں میں ایک نمایاں نام محسن حسین صاحب کا ہے جبکہ تقی الحسن اور حضور برادران و ظہور برادران بھی معروف سوزخوانوں میں شمار ہوتے ہیں اور مؤخر الذکر اصحاب امروہا کے روایتی قدیم انداز کے نمائندہ ہیں۔ امروہا ہی سے تعلق رکھنے والے مظاہر حسین نقوی صاحب بھی بلند آہنگ میں سوزخوانی کرنے والے بزرگ سوزخوان ہی جن کے صاجزادگان ان کے باز و اور خود بھی سوزخواں ہیں۔ مظاہر نقوی صاحب انجمن سوزخوانان کے عہدیدار بھی رہے اور شاعری بھی کرتے ہیں۔ معروف مصور اقبال مہدی صاحب کے والد جن کی

عرفیت میرن صاحب تھی امروہا سے متعلق اور سوز خوانی سے وابستہ تھے۔ اگرچہ یہ خدمت محدود نوعیت کی تھی۔ امروہا ہی کے ایک صاحب فن سوز خواں حسینی صاحب بھی ہیں جو اس فن کی تکنیکی باریکیوں اور اس کے برتاؤ کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔

رام پور شاہجہاں پور بریلی مرادآباد وغیرہ کا اپنا کوئی متعین دبستان نہیں ہے تاہم دربار رام پور سے وابستگی کی بنا پر بعض نامور ماہرین فن اساتذہ اور سوز خوانی کو رام پور سے مخصوص و منسوب کردیا گیا لیکن درحقیقت یہ اودھ اور الور کے افراد تھے۔ اس لیے اس درباری وابستگی کو مقامی تشخص نہیں دیا جاسکتا۔ تاہم ضلع مظفر نگر و میرٹھ بالخصوص سادات بارہہ میں سوز خوانی اور سوز خوانوں کے متعدد نامور اور صاحب طرز خاندان، گھرانے اور دبستان موجود رہے ہیں جو اپنے مقامی رنگ کے علاوہ معاصرین سے بھی متاثر نظر آتے ہیں مگر اس میں ان کی اپنی انفرادیت بہر حال موجود ہے۔ سادات بارہہ والوں کا رنگ اور انگ ضلع بلند شہر (بشمول جارچہ، خورجہ اور چھولس) اور ضلع میرٹھ (بشمول سوانہ وغیرہ) میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ جس کی ایک مثال کراچی کے بزرگ سوز خواں عیوض علی صاحب جارچوی اور دوسرے لاہور کے ظہور جارچوی صاحب کے علاوہ اورنگ آباد ضلع بلند شہر کے نبی احمد نقوی صاحب بھی ہیں۔ تاہم ان علاقوں پر مشرقی پنجاب اور دہلی کے اثرات بھی بالواسطہ طور پر اثر انداز ضرور ہوتے رہے ہیں۔ ان کی سوز خوانی میں آس لینے کا رواج نہیں ہے۔ بلکہ اول تا آخر سارے بازو اپنے سُر (سوز خواں) کے ساتھ پورے کلام کی ادائی کرتے ہیں۔ کلام و پیغام سے قطع نظر سوز و سلام کی ادائی میں تو کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی مگر مرثیہ کی سادہ و پُر اثر اور متنوع طرز ادا سامعین پر خاطر خواہ اثرات مرتب کرتی ہے اور مہکی ہوتی ہے۔ اسی تسلسل میں سید نادر حسین صاحب کا اسم گرامی بھی آتا ہے جو اپنے عہد کے نامور صاحب فن لکھنوی انداز کے سوز خواں تھے اور جن کے صاحب زادے سید دلاور حسین صاحب بحمد للہ اس ورثہ اور بستہ کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ یعنی سیدھی سادی متاثر کن ادائی۔

سادات بارہہ میں یوں تو عیوض علی، فیاض، آل نبی، وصی حیدر، آل رسول صاحبان اور دوسرے نامور اکابر و بزرگان سوز خوانی کے نام آتے ہیں مگر گزشتہ چند دہائیوں میں جو حضرات خدمات انجام دیتے رہے ان میں عباس رانی پوری صاحب کے علاوہ ولی حیدر صاحب، ریاض حیدر زیدی صاحب، حشمت حسین زیدی صاحب، حشمت علی زیدی صاحب، سعید حیدر زیدی

صاحب، سید محمد عباس زیدی صاحب اور ان کے پسران (تہذیب برادران) علی اوسط زیدی صاحب، حسین احمد رضوی صاحب، انصار حسین زیدی صاحب، ظفر حسنین زیدی صاحب، اشرف حسین زیدی صاحب، قائم حسین زیدی صاحب، واحد حسین زیدی صاحب، صابر حسین زیدی صاحب، حشمت حسین صاحب و عزت زیدی صاحب، اکبر حسین زیدی صاحب، سبط حسن سوز میرٹھی صاحب، شیدا حسن زیدی صاحب، محمد رضا زیدی صاحب (لاہور والے) اور ان کے متعلقین وغیرہ۔ اگرچہ ان حضرات کا تعلق براہ راست سادات بارہہ سے نہیں ہے مگر سوزخوانی کا انداز اسی قسم کا ہے یعنی عزیز حیدر جلالوی، عباس صاحب، کرار صاحب، ڈاکٹر محتشم نقوی، حسن رضوی و ڈاکٹر سید آل حسن، مولانا خورشید، عابد ثروت مسعود نقوی و برادران، ڈاکٹر سجاد حیدر صاحب، محمد رضا یاس اور رضا صاحب نقوی برادران، لاہور والے کاظمی برادران اور پسران فیروز کربلائی، یہ تمام افراد بھی آس لے کر نہیں بلکہ سب ساتھ ہی پڑھتے ہیں۔

پنجاب کا طرز سوز و سلام

پنجاب میں اگرچہ باقاعدہ طور پر معروف طریقہ پر سوزخوانی کا زیادہ رواج اور جداگانہ انداز نہیں ہے۔ تاہم پنجاب خصوصاً مشرقی پنجاب کے ان علاقوں میں جو دہلی اتر پردیش، یا راجستھان سے قریب اور متاثر ہیں وہاں مقامی رنگ کی آمیزش اور موسیقی و گائیکی کے بعض گھرانوں اور خاندانوں/ دبستانوں کے زیر اثر سوزخوانی ہوتی رہی ہے جن پر لکھنؤ کی بہ نسبت آگرہ و دہلی کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں یعنی یہ حضرات باقاعدہ آس اور بازوؤں کا رسمی و روایتی اہتمام تو نہیں کرتے نہ ہی کلام کے انتخاب اور ترتیب کا لحاظ رکھتے ہیں کہ پہلے سوز پھر سلام اور آخر میں مرثیہ پڑھا جائے بلکہ اکثر حضرات مرثیہ یا سوز پڑھتے ہی نہیں اس کے بجائے وہ ایک آدھ رباعی، دوہڑا اور پھر ایک یا زائد سلام پڑھ لیتے ہیں جو کبھی تنہا اور کبھی اجتماعی (کورس کے) انداز میں پڑھتے ہیں۔ ان اساتذہ اور سلام خواں حضرات میں بہت سے فن کار و گلوکار بھی شامل ہیں اور اساتذہ فن موسیقی جن میں استاد چھوٹے غلام علی خان مرحوم اور ان کے فنی جانشین افتخار علی پیارے خان صاحب کے علاوہ مشہور رضا صاحب ماتمی بھی شامل ہیں۔ تاہم مشرقی پنجاب اور لاہور و مضافات کے بعض گھرانے، خاندان اور فن کاروں کے علاوہ بعض سوزخواں حضرات بھی روایتی

سوزخوانی کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ جن میں لاہور کے کاظمی برادران و پسران فیروز علی کربلائی نمایاں اور معروف ہیں۔ ان میں ایک معتبر نام استاد عاشق صاحب (رہتاس/ جہلم) اور دوسرا اشفاق صاحب مرحوم کا بھی شامل ہے۔

حیدرآباد (دکن) کا دبستان سوزخوانی

حیدرآباد (دکن) اپنی جداگانہ تہذیب و ثقافت کی وجہ سے جنوبی ہند کی اعلیٰ تعلیمی و تہذیبی روایات کا آئینہ دار ہے اور اقدار و اطوار کا یہ فرق اور امتیاز ہر شعبہ زندگی میں دیکھا جاسکتا ہے چنانچہ دکن کی عزاداری بھی اسی تہذیب کے زیر اثر سادہ مگر پروقار ہے۔ جس میں اہتمام و التزام اور تزک و احتشام کے ساتھ حد درجہ احترام پایا جاتا ہے اور عام زندگی کی طرح ٹھہراؤ اور متانت کا عنصر غالب ہے چنانچہ یہاں کی سوزخوانی میں بھی دھیما پن اور ٹھہراؤ پایا جاتا ہے۔

حیدرآباد (دکن) میں سوزخوانی کا رواج کم ہی رہا ہے اور بالعموم مجلس یعنی ذاکری و خطابت سے قبل چند افراد بیٹھ کر سوزخوانوں اور سوزخوانی کی طرز پر سلام اور مرثیہ پڑھتے ہیں اور یہ حضرات آس کا اہتمام و التزام نہیں کرتے اور مرثیہ خواں کہلاتے ہیں مختلف خاندانوں میں جو ممتاز و معروف اور نمائندہ و سربراہ سمجھے جاتے رہے ہیں وہ گزشتہ نصف صدی میں نثار حسین صاحب، ابراہیم علی صاحب، جہانگیر علی صاحب، وزیر علی صاحب، حمایت علی صاحب اور خصوصاً غلام حسین صاحب، سعادت علی صاحب، یاور خاں صاحب، وحید حسن صاحب، صمصام علی صاحب، کاظم علی صاحب وغیرہم ہیں ان کے شاگرد اور عہد حاضر کے نمائندہ بزرگ سوز خواں خادم علی صاحب عرف پاڑو بھائی ہیں جن کے متعلقین و معاونین اس ورثہ کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ یہ حضرات مرثیہ خواں کہلاتے اور کہلواتے ہیں۔ تاہم حیدرآباد میں سوزخوانی بھی ہوتی رہی ہے جس کا انداز وہی شمالی ہند کا روایتی طرز ادائی والا ہے یعنی باقاعدہ آس اور بازوؤں کا اہتمام کرتے ہیں اور سلام و مرثیہ سے پہلے قطعہ رباعی سوز وغیرہ بھی پڑھتے ہیں اگرچہ عمومی طور پر دکن میں یہ طریقہ مقبول و رائج نہیں رہا تاہم نظام دکن عثمان علی خان صاحب کے دربار سے وابستہ شاہی سوزخواں سید عابد حسین صاحب اسی طرز کے سوز خواں تھے جو لکھنؤ اور الور میں رائج تھی۔ عابد صاحب کے صاحبزادہ سید ناصر حسین صاحب اب بھی دکن میں بطور شاہی سوزخواں اس منصب فریضہ اور ورثہ

کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ بمبئی اور داؤدی بوہری جماعت سے تعلق رکھنے والے حضرات کی سوزخوانی ونوحہ خوانی حیدرآباددکن کی مرثیہ خوانی سے قریب تر ہے۔

حیدرآباددکن کے سوز خواں اور مرثیہ خواں جہاں ایام عزا اور مجالس میں سوز ومرثیہ خوانی کرتے ہیں وہیں معصومین سے منسوب محافل میں مدحیہ و منقبتی کلام بھی سوز خوانی کے انداز میں بیٹھ کر ادا کرتے ہیں یعنی یہی سوزخواں نہ صرف شہادت اور غم کی تقاریب میں اپنا فریضہ ادا کرتے ہیں بلکہ ولادت اور خوشی کی محافل میں اجتماعی قصیدہ خوانی بھی کرتے ہیں جو دکن کا انفرادی اعزاز و امتیاز ہے۔

الور و جے پور کا دبستان سوزخوانی

الور و جے پور کو اگرچہ پنجاب اور متصل علاقہ اتر پردیش (یوپی) کے آگرہ پھپر سر بھرتپور وغیرہ سے زیادہ متاثر ہونا چاہیے تھا لیکن خصوصاً الور میں جہاں راجستھانی تہذیب کی روایتی خصوصیات موجود تھیں وہیں آگرہ پھپر سر کے تہذیبی اثرات کے ساتھ دہلی اور خصوصاً عزاداری سے متعلق اودھ نے اور لکھنوی اقدار و اطوار زیادہ غالب تھے چنانچہ الور کی سوزخوانی آگرہ و دہلی کی بہ نسبت لکھنؤ سے زیادہ قریب تر ہے۔ روشن پاٹ دار راجستھانی کھنکتی ہوئی آوازیں، صحرائی اور چٹانی و پتھریلی گویا سنگلاخ اور اکھڑ صاف اور کھرے لب ولہجہ کو سروں کی مٹھاس اور متانت و شرافت اور وقار کی شیرینی اور ٹھہراؤ عطا کرکے لکھنوی انداز پر سوز خوانی کی بنیادوں کو مستحکم کرنا اس دبستان کا اعزاز و امتیاز ہے۔ الور اور مضافات کے لوگ کسی تصنع اور بناوٹ کے بغیر بلند آواز میں کھلے دل اور واشگاف انداز میں بات کرنے کے عادی ہیں۔ یہی انداز ان کی سوزخوانی میں بھی نمایاں ہے تاہم یہاں چونکہ فن اور فن کاروں کی قدر حوصلہ افزائی اور سرپرستی سرکاری و عوامی ہر دو سطح پر لکھنؤ اور اودھ کی طرح بھرپور طریقہ پر ہوتی تھی حتیٰ کہ ہندو راجا مہاراجا اور امرا بھی گوالیار کی طرح عزادار تھے اور عملی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے اس لیے یہاں اس فن کو بھی خوب خوب فروغ حاصل ہوا اور چونکہ یہ لوگ فن کار بھی تھے اور عزادار بھی لہٰذا اس امتزاج سے ایک نیا غیر معمولی دبستان وجود میں آیا جس کی ہیئت وساخت بنیادی طور پر لکھنؤ ہی سے ماخوذ و متاثر ہے وہی تکنیک وہی انداز وہی ترتیب و تنظیم وہی نشست و برخاست۔ فرق صرف اتنا ہے کہ لکھنؤ میں تیز آواز میں کلام یا بلند خوانی کو آداب شرفا کے خلاف سمجھا جاتا تھا لہٰذا سوزخوانی میں

بھی آواز سے زیادہ فن کی بلندی اور باریکیوں پر توجہ دی جاتی تھی۔ الور والوں نے پورے ہندوستان کا مطالعہ و مشاہدہ کیا خصوصاً آگرہ، دہلی اور لکھنؤ سے اثرات قبول کر کے اپنی روایات کے مطابق اسے بآواز بلند پیش کیا یوں ایک نمایاں طرز اور دبستان وجود میں آیا ہر علاقہ اور دبستان میں ایسے سوز اور کلام پڑھے جاتے ہیں جو زیادہ تر دھیمے نیچے اور کومل سُروں پر مشتمل ہوتے ہیں لیکن الور کے سوزخوانوں میں اگرچہ کومل اور دھیمے نیچے میٹھے سُر بھی حسب موقع استعمال ہوتے ہیں مگر زیادہ تر کلام اونچے سُروں پر مشتمل ہوتا ہے۔

اس خاندان سے براہ راست نہیں مگر بالواسطہ طور پر متعلق و متاثر دائم حسین صاحب بھی رہے جو معروف موسیقار و سوزخواں تھے ان سے متاثر ایک سوزخواں امیر علی زیدی مرحوم (حیدرآباد والے) بھی تھے جو فنی طور پر سہارنپور اور سادات بارہہ سے بھی متاثر تھے۔ براہ راست تو اس دبستان سے وابستہ نہیں رہے تاہم استاد معشوق علی خاں حیدری مرحوم کے بازو کی حیثیت سے علی ناصر جعفری و تنویر بیانوی بھی اس دبستان سے متعلق ہیں جو اپنے وطن مالوف آگرہ کی سوزخوانی بھی کرتے رہے اور عظیم الحسن صاحب کا بھی ساتھ دلوانے کی وجہ سے ان کے زیر اثر بھی رہے۔ اس لیے ان کا جداگانہ رنگ و تاثر قائم نہ ہو سکا نہ ہی انھیں کسی ایک دبستان یا خاندان میں شمار کیا جا سکتا ہے معشوق مرزا صاحب، انجمن سوزخوانان کے جعفر رضا صاحب، اقبال حسین صاحب، آغا لئیق الزماں صاحب، غلام حیدر عابدی تونگانوی صاحب اور مصطفیٰ حسین صاحب بھی انھیں میں شامل ہیں۔

استاد واحد حسین خاں مرحوم کا تعلق اگرچہ خورجہ سے تھا اور آپ حنفی العقیدہ محب اہل بیت خلیق و منکسر مزاج انسان اور ماہر فن استاد، گائیک قوال اور سوزخواں بھی تھے اور سوزخوانی آپ کو اپنے والد الطاف حسین خاں صاحب سے ورثہ میں ملی تھی جو ہندوستان کے چند ممتاز و نمائندہ استادوں میں شمار ہوتے تھے مگر واحد حسین خاں اپنی روشن بلند خوب صورت اور شاندار آواز کی وجہ سے بھی فطری و مزاجی طور سے الور والوں سے متاثر نظر آتے تھے یعنی آپ کی سوزخوانی کا کوئی جداگانہ پس منظر، انداز اور تشخص یا دبستان نہ تھا بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ استاد معشوق علی خان کے گھرانے کا کوئی استاد پڑھ رہا ہے۔ خاں صاحب، بازوؤں یا آس کے محتاج تو نہ تھے مگر روایت کے احترام میں اس کا اہتمام ضرور کیا کرتے تھے۔ سوز و سلام خوب خوب پڑھا کرتے تھے تاہم مرثیہ کی کمی اور تشنگی محسوس ہوتی تھی اتنی روشن بلند خوش نما اور توانا سریلی پختہ آواز استاد معشوق علی

خاں اور استاد عظیم الحسن صاحب کے علاوہ نے بہرحال نہیں سنی اور جن حضرات کے تذکرے ملتے بھی ہیں ان کے آثار محفوظ نہیں رکھے جاسکے۔ جو پوری مہارت کنٹرول اور کمانڈ سے ہر کلام بلکہ ہر لفظ کو اس کے استحقاق پر ادا کرتے تھے۔ تاہم اس ضمن میں کھیر تل کے تقی صاحب بھی ہیں جو سائیں تقی اور بابا تقی اور میر صاحب کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں جن کے صاجزادگان شاعر اہل بیت میر رضی میر صاحب اور سوز خواں مہدی صاحب کراچی میں اس ورثہ کو سنبھالے ہوئے تھے، الوری کی تمام خوبیاں رکھتے تھے جبکہ مشہور سوز خوان ابرار نقوی مرحوم کے فرزند عابد حسین ہاتف الوری صاحب بھی اپنے روایتی ورثہ کو سنبھالنے کے لیے کوشاں ہیں۔ علاوہ ازیں یہاں کے بزرگ سوز خوانوں میں سردار صاحب اور موسیٰ رضا صاحب کے اسمائے گرامی بھی نمایاں ہیں جبکہ شاعر و سوز خوان الیاس دھولپوری صاحب کا طرز ادائی بھی یہی رہا ہے۔

استاد معشوق علی خاں مرحوم نے نہ صرف خاندانی سرمایہ محفوظ کیا بلکہ اس میں گراں قدر اضافہ بھی کیا اس طرح ان کے بھائی استاد اشتیاق علی خاں مرحوم نے بھی اپنے خاندانی سرمایہ کو محفوظ کرنے کی کوشش کی اور اپنے مزاج کے مطابق خاطر خواہ اضافہ بھی کیا۔

ادارۂ ترویج سوزخوانی سے وابستہ سوزخوان

سبط جعفر زیدی، زندگی بھر فن سوزخوانی کے فروغ کے لیے کوشاں رہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ادارۂ ترویج سوزخوانی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ انھوں نے اخبارات میں مضامین اور صوتی علوم وفنون اسلامی کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی۔ سوزخوانوں کی رہنمائی کے لیے کیسٹس جاری کیے اور بستہ کے عنوان سے ایک کتاب یادگار چھوڑی۔

سبط جعفر زیدی نے اپنی زندگی میں ہی شاگردوں کی ایک بڑی تعداد کی تربیت کی جو ان کی شہادت کے بعد ان کا ورثہ سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان شاگردوں میں ان کے استاد بھائی امتیاز عباس کا نام سرفہرست ہے۔ ان کے علاوہ ان کے نمایاں شاگردوں میں منور عباس کاشف زیدی، حسین اختر زیدی، شکیل حیدر جعفری، سید ابرار حسین، سید رضوان عباس اور کئی دوسرے سوزخوان شامل ہیں[1]

---

[1] صوتی علوم وفنون اسلامی، سبط جعفر زیدی، سید اینڈ سید، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص: ۱۰۳،۱۰۴

دسواں باب

سوز خوانی اور خواتین

اردو کے سبھی تذکروں میں حیدرآباد (دکن) کی ماہ لقابائی چندا کو اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ محمد علی خان نے اپنی کتاب "تذکرہ ذاکرین" میں ان کی سوز خوانی کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"یہ بی بی اعلیٰ درجے کی سوز خوانی کرتی تھیں، جس طرح اپنے کمال میں مشہور تھیں اسی طرح ذاکری میں ان کا مثل و نظیر نہیں تھا اور جس طرح خداوند عالم نے ان کو خوب صورت بنایا تھا اسی طرح آواز بھی خداداد پائی تھی۔ انھوں نے بڑے بڑے استادوں سے باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ اہل مجلس ان کی سوز خوانی سننے کے لیے دور دور سے بہت اشتیاق کے ساتھ آتے تھے۔ ان کے عاشور خانے میں ہزاروں کا مجمع رہتا تھا اور اہل مجلس ان کی سوز خوانی خاص توجہ سے سماعت کرتے تھے۔ وہ بڑی عاشق حسین تھیں اور غرۂ محرم سے ماہ صفر تک سوائے سوز خوانی کے گانا بجانا بالکل ترک کر دیتی تھیں۔ ان کے استاد خوشحال خان صاحب تھے"[1]

ڈاکٹر سکندر آغا نے اپنی کتاب سوز خوانی، تاریخ و تذکرہ میں میر انشا اللہ خاں انشا کی تین بیٹوں یا نواسیوں کا ذکر کیا ہے جو امجد علی شاہ کے محل میں ملازم تھیں۔ یہ تینوں خوش گلو مرثیے سوز میں پڑھتی تھیں۔ بڑی کا نام حیدری بیگم، منجھلی کا محمدی بیگم اور چھوٹی کا نام ننھی بیگم تھا[2]

ڈاکٹر صفدر حسین نے اپنی کتاب لکھنؤ کی تہذیبی میراث میں لکھا ہے کہ:

"سوز خوانوں نے بھی انھیں عام پسند و عام فہم راگنیوں کو زیادہ رواج دیا جو مذہب کی

---

[1] تذکرہ ذاکرین، محمد علی خان، مشیر عالم پریس، حیدرآباد (دکن)، ۱۳۶۱ھ، ص: ۳۰

[2] سوز خوانی، تاریخ و تذکرہ، ڈاکٹر سید سکندر آغا، لکھنؤ ۱۹۹۹ء، ص: ۲۲

سفارش سے گھر بیٹھنے والی عورتوں تک کے گلے میں اتر گئیں۔ یہاں تک کہ بڑے باکمال گویے نقش حیرت بن گئے''۳

کم و بیش یہی بات عبدالحلیم شرر نے بھی تحریر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میر علی حسن اور میر بندہ حسن کے گلے سے نکلتے ہی سوزوں کی مؤثر اور دل پاش پاش کر دینے والی دھنیں صدہا شریف مردوں کے گلے میں اور ان کے ذریعے سے ہزارہا شریف شیعہ خاندانوں کی عورتوں کے نور کے گلوں میں اتر گئیں۔ لکھنؤ میں بعض شریف، شائستہ اور تعلیم یافتہ عورتیں ایسی اچھی سوز خوان ہیں کہ اگر پردے کی روک نہ ہوتی تو مرد سوز خوان ان کے مقابلے میں ہرگز فروغ نہ پا سکتے''۴

ڈاکٹر فضل امام بھی شرر کے اس بیان کی گواہی دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''یہ حقیقت ہے کہ اودھ کی سرزمین سوز خوانی کے لیے راس آئی یہاں پر اسے مذہب کی سرپرستی میں فروغ حاصل ہوا اور جزو عزاداری بن گئی۔ جب ایام عزا میں کوچہ و بازار سراپا غم ہو جاتے تو سوز خوانی کا سوز دلوں کو برماتا اور گرانجگی پیدا کر دیتا۔ امراء اور رؤسا کے ساتھ عوام بھی اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اچھی سوز خوانی کے باعث بڑے بڑے درباروں اور نواب ملکہ کشور محل تک باریابی ہو جاتی تھی۔ لہٰذا عوام و خواص دونوں سوز خوانی کے فن کے دلدادہ نظر آتے ہیں''۵

مرزا محمد ہادی رسوا، جو لکھنؤ تہذیب کے سچے رازدار ہیں اپنے شاہکار ناول ''امراؤ جان ادا'' میں امراؤ کی زبانی ہی پیش کرتے ہیں۔ وہ نواب جعفر علی خان کا ذکر کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ:

''فن موسیقی میں ان کو کمال تھا۔ کیا مجال کوئی ان کے سامنے گا سکے۔ اچھے اچھے گویوں کو ٹوک دیا۔ سوز خوانی میں یکتا تھے۔ سندی سوز میر علی صاحب کے ان کو پہنچے ہوئے تھے ان کی ملازمت سے مجھ کو یہ فائدہ ہوا کہ سیکڑوں سوز یاد ہو گئے۔ دور دور میری شہرت ہو گئی۔ میری سوز خوانی مشہور تھی۔ ایسی ترکیبیں اور کسی کو کب یاد تھیں۔ بڑے بڑے سوز خواں میرے سامنے

---

۳ لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ڈاکٹر صفدر حسین، بارگاہ ادب، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص: ۲۶۷

۴ گزشتہ لکھنؤ، عبدالحلیم شرر، لکھنؤ، ۱۹۷۱ء، ص: ۲۱۵

۵ سوز خوانی: روایت اور آداب، ڈاکٹر سید فضل امام، مشمولہ: اردو مرثیہ، مرتبہ ڈاکٹر شارب ردولوی، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۳۳۵

منہ نہ کھول سکتے تھے۔ اسی سوزخوانی کی بدولت نواب ملکہ کشور محل تک میری رسائی ہوئی۔ سرکار شاہی سے مجھ کو بہت کچھ ہر محرم میں عطا ہوتا تھا۔ مرثیہ خوانوں میں میرا اسم تھا''۔[۶]

ڈاکٹر اسد اریب لکھتے ہیں:

''اس فن میں شریف زادیوں، نیک نہاد بہوؤں اور بیٹیوں کے علاوہ بازاری عورتوں نے بھی بڑا نام کمایا۔ لکھنؤ کی طوائفیں، زہرہ اور مشتری، مشہور سوزخواں فرمائشی طور پر امیر امرا کے ہاں زنانی مجلسوں میں باقاعدگی سے بلوائی جاتیں۔ خاص طور پر چونے والی حیدر کا تو یہ عالم تھا کہ لوگ اس کا سوز سننے کے لیے محرم کے دن گنا کرتے تھے۔ ہزاروں لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ حیدر کے امام باڑے کے باہر جمع ہو جاتے کہ کب بی بی حیدر اپنا سوز پڑھیں اور غم کی جان لیوا لذت احساس سے سننے والوں کا دل سینے سے باہر آ نکلے۔ اہل عزا نے ایسے باکمالوں کو ہمیشہ اپنے سر پر بٹھایا اور آنکھوں میں جگہ دی''۔[۷]

نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں تک نے اس فن میں شرف کمال حاصل کیا۔ شرفا کی بہو، بیٹیوں نے زنانی مجلسوں میں عزاداری کی رونق بڑھانے کے لیے سوزخوانی کا فن حاصل کیا۔ طوائفوں نے اپنے کسی ذوق کے تحت اس فن کو اپنایا۔ بعض ستار نواز سازندے، موسیقار اور وہ تمام لوگ جو استاد جی کے لقب سے ممتاز تھے، سوز جانے بغیر اس مرتبے کو نہ پا سکتے تھے۔ لکھنؤ شہر کی کئی ایسی طوائفیں تھیں جو صرف سوزخوانی کے لیے مقبول تھیں اور ایام عزا میں انھیں اس مقصد کے لیے دور دور سے بلایا جاتا تھا۔ ایسی طوائفوں میں ہندوستان کی مشہور طوائف تمن بائی بھی تھیں، جنھوں نے دوسری جنگ عظیم کے بعد میونسپل ممبری لکھنؤ کے امیدوار کی حیثیت سے محض اس وجہ سے کامیابی حاصل کی کہ وہ ایک مقبول سوزخواں تھیں۔[۸]

ڈاکٹر سکندر آغا نے اپنی کتاب ''سوزخوانی: تاریخ و تذکرہ'' میں متعدد سوزخوان خواتین کا ذکر کیا ہے۔ جن میں اختر جہاں، جیو بیگم، زرینہ بانو، سکندر جہاں، شگفتہ بانو، عباس باندی، لئیق بانو، عشرت بانو، کلو، کنیز مرتضیٰ بیگم، کرامت الزہرا، مغل جان اور مرتضیٰ باندی کا ذکر کیا ہے۔ مرتضیٰ

---

[۶] امراؤ جان ادا۔ مرزا ہادی رسوا، خزینہ علم و ادب، لاہور۔ ۲۰۰۰ء، ص: ۸۷

[۷] اردو مرثیے کے نئے صنعت گر، ڈاکٹر اسد اریب۔ کتاب نگر، ملتان، سن ندارد، ص: ۲۰۸

[۸] اردو مرثیے کے نئے صنعت گر، ڈاکٹر اسد اریب۔ کتاب نگر، ملتان، سن ندارد، ص: ۲۱۱

باندی کا تعلق محمود آباد کے سوز خوان گھرانے سے تھا۔ وہ اختر وصی علی کی چھوٹی بہن تھیں اور ۱۹۷۱ء میں ترک وطن کر کے پاکستان آ گئی تھیں جہاں ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔۹

مرتضٰی باندی کی بھاوج اور اختر وصی علی کی اہلیہ کجن بیگم بھی اپنے عہد کی معروف سوز خوان تھیں۔ کجن بیگم کا اصل نام امام باندی تھا اور وہ ۱۹۳۲ء کے لگ بھگ لکھنؤ کے قریب موضع سادات رسول پور میں پیدا ہوئی تھیں۔ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ انھوں نے اپنی والدہ حسینی بیگم کے ساتھ سوز خوانی کا آغاز کیا۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۰ء میں انھوں نے ریڈیو پاکستان سے سوز خوانی شروع کی۔ ۱۹۵۲ء میں ان کی شادی اختر وصی علی سے ہو گئی جو خود بھی ایک بہت اچھے سوز خواں تھے۔ کجن بیگم نے کلاسیکی موسیقی کی تربیت بھی حاصل کی تھی۔ وہ ٹھمری، دادرا، غزل اور پوربی گیت گانے میں مہارت رکھتی تھیں اور رسولن بائی اور ہیرابائی بڑودکر کے اسلوب میں گاتی تھیں۔ انھیں فضل احمد کریم فضلی نے فلم چراغ جلتا رہا میں گانا گانے کی پیشکش کی تھی مگر ان کے والد نے اس کی اجازت نہیں دی تاہم کجن بیگم نے اپنی صاحبزادی مہناز کے فلمی گانے پر پابندی نہیں لگائی جو پاکستان کی صف اوّل کی گلوکارہ شمار ہوتی ہیں۔ کجن بیگم کا انتقال ۱۰ فروری ۲۰۰۰ء کو کراچی میں ہوا۔ ان کی وفات کے بعد حکومت پاکستان نے انھیں صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی عطا کیا تھا۔ وہ یہ اعزاز حاصل کرنے والی پاکستان کی واحد سوز خوان ہیں۔۱۰

کجن بیگم کے بعد پاکستان میں جس خاتون سوز خوان نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی ان کا نام صابرہ کاظمی ہے۔ ان کا تعلق آفتاب علی کاظمی اور مظاہر علی کاظمی کے گھرانے سے ہے۔ وہ ۱۲ فروری ۱۹۴۵ء کو علی گڑھ کے قصبے جلالی میں پیدا ہوئیں اور اپنے والدین کے ساتھ دو برس کی عمر میں پاکستان آ گئیں۔ انھوں نے دس برس کی عمر میں اپنی والدہ کے ساتھ بازو کے طور پر سوز خوانی کا آغاز کیا۔ ان کی سوز خوانی اور نوحوں کے متعدد کیسٹس ریلیز ہوئے جو سننے والوں میں بہت مقبول ہوئے۔ وہ کراچی میں قیام پذیر ہیں۔

کراچی ہی میں قیام پذیر ایک اور سوز خوان سیکہ خاتون تھیں۔ ان کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ ان کے والد اور والدہ دونوں سوز خوانی کے فن سے وابستہ تھے اور محمود آباد اور لکھنؤ دونوں مقامات پر سوز

---

۹ سوز خوانی، تاریخ و تذکرہ، ڈاکٹر سید سکندر آغا، لکھنؤ۔ ۱۹۹۹ء، ص: ۲۲۷

۱۰ پاکستان کرونیکل۔ عقیل عباس جعفری۔ ورثہ پبلی کیشنز، کراچی۔ ۲۰۱۸ء، ص: ۸۵۳

خوانی کرتے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں وہ پاکستان آئیں اور پھر اس شہر میں سوز خوانی کا آغاز کیا۔ انھوں نے کراچی کے تقریباً امام باڑوں میں سوز خوانی کی۔ وہ مرثیوں، سوز وسلام اور قصیدوں کا انتخاب بہت احتیاط سے اور حسب موقع کرتی تھیں۔ سبیکہ خاتون کا انتقال ۲۰ مارچ ۲۰۱۳ء کو ہوا۔

کراچی میں سوز خوان خواتین کی ایک بڑی تعداد ایام عزا میں خدمت اہل بیت کے شرف سے فیضیاب ہوتی ہے۔ ۱۹۹۰ء کے لگ بھگ کراچی میں جو خواتین سوز خوان فعال تھیں ان میں بیگم مصطفیٰ، خانوادۂ آغا مقصود مرزا، خانوادۂ استاد معشوق علی خان، خانوادۂ استاد اشتیاق علی خان، خانوادۂ آفتاب علی کاظمی، خانوادۂ عظیم الحسن، بیگم زوار حسین، بیگم زاہد فتح پوری و دختران، صالحہ خاتون قمر، انیس فاطمہ، برجیس نقوی، آداب زہرا، فرزانہ فتح یاب، کوکب رضوی، شیریں رضوی، محترمہ مبشرہ عادل، طیبہ بیگم عرف جمیلہ آپا، محترمہ عسکری شہناز، محترمہ نیرّ فاطمہ اور محترمہ طیبہ بیگم کے نام سرفہرست تھے۔ منظور حسنین آرزو نے اپنی کتاب ''عزاداریٔ امروہا، ہمارا مذہبی ورثہ'' میں امروہا کی ان سوز خوان خواتین کا ذکر کیا ہے جو کراچی میں اس فن کی خدمت کے تعلق سے معروف ہیں۔ ان خواتین میں ثروت بانو نقوی، بیگم ناز عارف نقوی، بیگم منور علی زیدی، شائستہ سبطین جعفری، بیگم حسن زیدی نقوی، دختران انتخاب نقوی، بیگم مہر شباب نقوی، دختران کاظم حسین نقوی، دختران سراج الحسن نقوی، ثمرین کنول نقوی، فاطمہ کلثوم، فاطمہ افشاں، افشین جمیل، کنیز فاطمہ، دختران زاہد حسین، شان زہرا نقوی، دختران ہلال حیدر نقوی، دختران محمد اعجاز زیدی اور دختران آباد محمد نقوی زائر کے نام سرفہرست ہیں۔ لاہور میں سوز خوانی کی نسبت سے جو خواتین معروف ہوئیں ان میں شمس الزہرا، ماہ پارہ صفدر اور طلعت زیدی کے نام شامل ہیں۔

گیارہواں باب

سوز خوانی کے موضوع پر چند اہم کتابیں

برصغیر میں سوز خوانی کے فن کو تین صدیاں ہونے کو آئیں، مگر حیران کن بات یہ ہے کہ اس موضوع پر حوالہ جاتی لوازمہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ راقم نے جب اس موضوع پر کام کا آغاز کیا تو محض چند کتابیں اور درجن بھر مضامین دستیاب ہو سکے جو مختلف جرائد میں بکھرے ہوئے تھے۔

یہ ۱۳۵۵ھ کی بات ہے جب حیدرآباد (دکن) میں مقیم ایک معروف سوز خوان محمد علی خان کو کتب خانہ نواب سالار جنگ کے مہتمم مولوی میر عباس نے حیدرآباد (دکن) میں مقیم مرثیہ نگاروں کو ایک تذکرہ لکھنے کی تجویز پیش کی۔ محمد علی خان نے اس تجویز پر لبیک کہا اور نہ صرف مطبوعہ تاریخ کتب بلکہ قلمی اور معتبر ماخذوں کی مدد سے حیدرآباد (دکن) سے آصف جاہ کے عہد سے اپنے عہد (عہد عثمان علی خان) تک کے تمام سوز خوانوں کے حالات اکٹھا کرنا شروع کیے۔ اس سلسلے میں انھوں نے نہ صرف کتب خانوں کی خاک چھانی بلکہ ہر عہد کے سوز خوانوں کے حالات بہم پہنچانے کے لیے مرحوم سوز خوانوں کے ورثا سے بھی رابطہ کیا۔

۱۹۴۲ء مطابق ۱۳۶۱ھ میں جب واقعہ کربلا کو تیرہ سو برس مکمل ہوئے اور ہندوستان بھر میں تیرہ سو سالہ یادگار حسینی منایا گیا تو محمد علی خان نے اپنا جمع کردہ اثاثہ تذکرہ ذاکرین کے نام سے قارئین تک پہنچا دیا۔ اس تذکرے میں حیدرآباد (دکن) کے علاوہ ان سوز خوانوں کے حالات بھی درج ہیں جو ہر سال لکھنؤ سے سوز خوانی کے لیے حیدرآباد (دکن) مدعو کیے جاتے تھے۔

اس تذکرے کا تعارف علامہ رشید ترابی نے تحریر کیا تھا، جن کے نام کے ساتھ عمدۃ الذاکرین کا لقب تحریر کیا گیا تھا۔ سوز خوانی کے موضوع پر تحریر کی گئی یہ اولین کتاب اب نایاب ہے۔

تذکرۂ ذاکرین کی اشاعت کے بعد ۱۹۹۵ء میں سید سبط جعفر زیدی کی کتاب ''صوتی علوم و فنون اسلامی'' منظر عام پر آئی جس میں فن قرأت، حمد و نعت، اذان و اقامت، صلوٰۃ و سلام، سماع، ذاکری و تحت خوانی، نوحہ خوانی اور سوز خوانی کے فنون کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس کتاب کا لوازمہ ۲۴۷ صفحات پر محیط تھا جن میں سے ۵۴ صفحات سوز خوانی کے لیے مخصوص کیے گئے تھے۔

۱۹۹۹ء میں لکھنؤ سے ڈاکٹر سید سکندر آغا کی کتاب ''سوز خوانی (تاریخ و تذکرہ)'' منظر عام آئی۔ اس تذکرے میں سوز خوانی کے بارے میں تو بہت کم معلومات درج تھیں تاہم ماضی اور حال کے ۶۶ سوز خوانوں کے حالات محفوظ کر لیے گئے تھے۔ ان سوز خوانوں میں دو غیر مسلم سوز خوان جیوتی سروپ پانڈے اور پھمو مہاراج اور پاکستان کے پانچ سوز خوان آباد محمد نقوی زائر، نجم الحسن رضوی، سبط جعفر زیدی، ظہور جارچوی اور مرتضیٰ باندی کے نام بھی شامل تھے۔ اس تذکرے کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس میں شامل سوز خوانوں کے حالات میں ان کے بستے کا اہم کلام بھی شامل کیا گیا تھا۔

پاکستان میں سوز خوانی کے تعلق سے چند ایسے مجموعے بھی شائع ہوئے جن میں سوز خوانی میں پڑھے جانے والے کلام کو محفوظ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کا پہلا مجموعہ ''چشمِ غم'' تھا جو انجمن سوز خوانان، کراچی کے اہتمام میں ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے کے پہلے ایڈیشن میں ۳۰ مرثیے شامل تھے جن میں سے ۲۸ حضرت نسیم امروہوی کے اور ۲ ان کے جد امجد حضرت شمیم امروہوی کی تحریر کردہ تھے۔ اس مجموعے میں کراچی کے سوز خوانوں کی چند نادر تصاویر بھی شامل کی گئی تھیں۔ اس مجموعے کا انتساب علامہ رشید ترابی کے نام کیا گیا تھا جو انجمن سوز خوانان پاکستان کے بانی بھی تھے اور ہر سال اس کی سالانہ مجلس میں جو ۱۹ صفر کو منعقد ہوتی ہے بہ نفس نفیس شرکت فرماتے تھے۔ اس مجموعے کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۲۰۲۰ء میں اس مجموعے کا بارہواں ایڈیشن شائع ہوا ہے جس میں ۶۸ مرثیے شامل ہیں۔

۱۹۸۱ء۔۸۲ میں کراچی سے دو حصوں میں ''سوز کربلا'' کے عنوان سے تاریخ وار مرثیوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا جس میں وفات رسول اللہ سے شہادت امام حسن اور سفر امام حسین سے شام غریباں تک پڑھے جانے والے مرثیے محفوظ کیے گئے تھے۔ اس مجموعے کو حسن عباس زیدی نے مرتب کیا تھا اور اس کی تقریظ پروفیسر نعیم تقوی نے اور پیش لفظ ڈاکٹر ہلال نقوی نے تحریر کیا تھا۔

۱۴۱۱ھ مطابق ۱۹۹۰ء میں سید قیصر حسین قیصر مشہدی کا مرتب کردہ تاریخ وار مرثیوں کا ایک اور مجموعہ دو حصوں میں شائع ہوا جس کا نام ''تنویرِ غم'' تھا۔ قیصر حسین قیصر مشہدی نے اسی نوع کے چند اور مجموعے بھی مرتب کیے تھے جن میں نوائے غم (۱۳۸۸ھ)، عرفان غم (۱۴۱۴ھ)، سوز غم (۱۴۲۱ھ) اور نوائے کربلا کے نام شامل ہیں۔

۲۰۰۰ء میں سید سبط جعفر زیدی نے ادارۂ ترویج سوز خوانی کے اہتمام میں ''بستہ'' کے عنوان سے سوز خوانی میں پڑھے جانے والے کلام کا ایک وقیع مجموعہ شائع کیا۔ اس مجموعے میں قطعات، رباعیات، سوز، سلام، مرثیہ، نوحہ، حمد، نعت اور مناقب کا بہت خوب صورت انتخاب شامل تھا۔ اس مجموعے میں یہ بھی کوشش کی گئی تھی کہ ہر کلام کے شاعر کا نام بھی تحریر کیا جائے۔

اسی نوعیت کا ایک مجموعہ ۲۰۱۵ء میں ''کربِ کربلا'' کے نام سے شائع ہوا جسے علامہ سید ماجد رضا عابدی نے ترتیب دیا تھا اور اسے سمانہ آفتاب میموریل فاؤنڈیشن کے اہتمام میں شائع کیا گیا تھا۔ اس مجموعے میں سوز، سلام، مرثیے اور نوحے چہاردہ معصومین کے ایام وصال وشہادت کے حساب سے ترتیب دیے گئے تھے۔

۲۰۱۴ء اور ۲۰۱۵ء میں کراچی سے محمد حسین نگر بھکری کا مرتب کردہ تاریخ وار مرثیوں کا مجموعہ ''شمشیرِ غم'' دو حصوں میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں انیس، دبیر، مونس اور فراست زید پوری کے مرثیے تاریخ وار ترتیب دیے گئے تھے۔ یہ مجموعہ کراچی سے مکتبۃ الحسین، مسجد سید الشہداء، اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی کے اہتمام میں شائع ہوا۔

۱۹۵۰ء کی دہائی میں ماسٹر شریف حسین حیدر پانی پتی نے بھی سوز خوانی کے کئی مختصر مجموعے مرتب کیے تھے جن میں مرقع عزا، رونق عزا اور مجموعہ سوز کے نام سرفہرست تھے، اب یہ مجموعے نایاب ہیں۔

بارہواں باب

اصطلاحات سوز خوانی

ہر فن لطیف کی طرح سوز خوانی کے فن میں بھی بعض ایسی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں جن سے اس فن سے دلچسپی رکھنے والے افراد کا واقف ہونا ضروری ہے۔ شائقین فن کے استفادے کے لیے ان اصطلاحات کی تشریح ذیل میں درج کی جارہی ہے۔

آس

سوز خوانوں کو سہارا دینے کے لیے بازوؤں کا عمل تاکہ آواز کا تسلسل، لے اور رنگ قائم رہے۔

عنادل جو ہوتے ہیں نغمہ سرا
انھیں آس دیتی ہے موج صبا
(بے نظیر شاہ)

آکار

لغوی معنی جسم، روپ، صورت، شکل، اصطلاحی معنی سوز خواں کی ہم نوائی کے لیے "آ" کی آواز نکالنا۔ وسیع معنی میں یہ اصطلاح دوران گائکی کے حروف کے اپنے صحیح مخرج سے ادا ہونے کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے مثلاً لفظ "آ" اس طرح ادا ہو کہ "او" معلوم نہ ہو۔ اس طرح "ن" کی آواز ناک سے اور "ق" کی آواز حلق سے ادا ہو، اس اعتبار سے درست تلفظ کو بھی آکار کہتے ہیں۔

بازو

مرثیے کو بطور سوز پڑھنے والے اصل شخص (صاحب بستہ یا سُر) کی ہم نوائی کرنے یا ہم آواز ہو کر پڑھنے والے افراد۔ وہ شخص جو گویے یا مرثیہ خواں کے ساتھ آس لگاتا ہے۔ جماعت

کے درمیان استاد کے کلام کے کسی ایک خاص مصرع کو اُٹھانے والے لوگ۔

میں اکیلا اپنے غم کی شرح کرسکتا نہیں
کوئی مثل مرثیہ خواں چاہیے بازو مجھے
(ناسخ)

مرثیہ ہم دل مقتول کا پڑھتے اے داغ
اس کی مجلس میں مگر کوئی بھی بازو نہ ہوا
(داغ)

گر مرثیہ خوانی پہ دل آئے کبھی میرا
تُو ہووے تو داؤد کو بازو نہ کروں میں
(مصحفی)

بعض محققین کے مطابق صاحب بستہ یا سُر کے دائیں جانب بیٹھنے والے فرد کو بازو اور بائیں جانب بیٹھنے والے فرد کو جوابی کہا جاتا ہے۔

فصل خزاں میں بلبل ہے گل کا مرثیہ خواں
مرغان باغ کب ہیں اس کے جوابیوں میں
(میر)

بندش

شعر یا جملے کے الفاظ کا دروبست، (کسی مضمون یا خیال کی) لفظوں میں ادائی۔ منتخب کلام کی طے شدہ طرز یا دھن۔

بندش قافیہ ہو شعر میں اس حسن سے بحر
ابروئے یار کا دھوکا ہو جو تلوار بندھے
(امداد علی بحر)

بستہ

(۱) وہ بیاض یا ڈائری جس میں سوزخوان مختلف شاعروں کا کلام محفوظ کرتا ہے۔

(۲) مرثیہ خوانی کے مختلف دبستان، مکاتب اور گھرانے۔

بہلاوے

کسی ایک راگ پر دیر تک رک کر اسے پھیلانا اور اس کی مختلف شکلیں دکھانا۔

بیاض

سادہ یا لکھے ہوئے اوراق کی مجلد یا غیر مجلد کتاب جس میں چیدہ و منتخب اشعار لکھے گئے ہوں۔

مری بیاض ہے قائم مشابہ خط بند
زبس میں لکھ کے ہر اک بیت پر قلم کھینچا

تکیہ

سوز خواں کے سامنے رکھنے کی وہ چیز جو عموماً مستطیل وضع کے کپڑے کے غلاف میں روئی یا پَر یا کوئی اور نرم چیز بھر کر تیار کی جاتی ہے، سوز خوان اس تکیے پر اپنی بیاض یا بستہ رکھ کر پڑھتے ہیں۔

جو سوز خواں کا ہو ذکر حسین پر تکیہ
بیاض و بستہ و بازو کو آس ملتی ہے

جماعت

مرثیہ خوان اور ان کے جوابی حضرات (بازوؤں) کو ایک جماعت کہتے ہیں۔ ہر جماعت میں کم از کم دو بازوؤں کا ہونا ضروری ہے۔

دنگل

وہ مجلس جس میں دس جماعت سے زیادہ مرثیہ خواں، سوز خوانی کریں۔ یہ حیدر آباد دکن کی خاص اصطلاح ہے جہاں بعض دنگل صبح سے شام تک ہوتے تھے اور بعض شام سے صبح تک۔

رباعی

بحر کے مقرر چوبیس اوزان میں سے کسی ایک یا زیادہ وزن میں کہی ہوئی چار مصرعوں والی نظم جس کے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرع میں قافیہ ہو۔ سوز خواں حضرات بالعموم کسی رباعی سے اپنی پڑھت کا آغاز کرتے ہیں۔

زمزمہ

دھیمے سُروں کا راگ، کم آواز کا راگ، ترانہ، نغمہ یا گانا۔ وہ آواز جو گلے کے انتہائی اندر سے ایک خاص حرکت کے ساتھ نکلے، گٹکری، مرکی۔

دشت غربت میں عبادت حسن پیکر ہوگئی
زمزمہ ساز اذاں آواز اکبر ہوگئی
(صبا اکبرآبادی)

سلام

ایک قسم کی رثائیہ اور مدحیہ نظم جو غزل کی ہیت پر ہوتی ہے اور جس میں عموماً واقعہ کربلا کا ذکر ہوتا ہے۔ وہ اشعار جن میں شہدائے اہل بیت، غازیان کربلا اور آل محمد کی مدح وثنا اور تسلیم کا پہلو ہو، دنیا کی بے ثباتی، حق کی فتح اور راہ خدا میں جان دینے والوں کی عزمت وحرمت کا بیان ہو۔ سلام کے اشعار کہلاتے ہیں۔

مدح علی میں ہے یہ بلندی کلام کی
عرش بریں زمیں ہے ہمارے سلام کی
(دبیر)

بچے جو اگلے برس ہم ہیں اور یہ غم پھر ہے
جو چل بسے تو یہ اپنا سلام آخر ہے
(سید آل رضا)

سوز

مرثیے کے ایک یا دو منتخب بند جن میں حزنیہ اور بکائیہ مضامین ہوں، سوز کہلاتے ہیں۔ بعض شاعروں نے سوز علیحدہ سے بھی نظم کیے ہیں جن میں مونس لکھنوی کا سوز ''مجرئی خلق میں ان آنکھوں نے کیا کیا دیکھا'' خصوصاً قابل ذکر ہے۔

لحن کے گر دوش پر الفاظ ہوں تو سوز ہے
دوش پر لفظوں کے گر ہو لحن تو گانا ہے یہ

سوز ہی وہ ہے کہ جس سے جاگ اٹھے سوز دروں
موجب گریہ ہو تو جنت کا پروانہ ہے یہ
(آباد محمد نقوی زائر)

سوز خواں

وہ مرثیہ خواں جو لحن میں تنہا یا اپنے ساتھیوں کی مدد سے سوز پیش کرے۔

ذاکر شبیر یعنی قدر دان اہل بیت
سوز خوان آل، وقف آستان اہل بیت
سوز میں بھرتا ہے زیر و بم سے یہ تاثیر غم
کیف غم سے آشنا ہے سوز خوان اہل بیت
(آباد محمد نقوی زائر)

صاحب بستہ

سر یا مرکزی سوز خوان جو وقت سوز خوانی درمیان میں بیٹھتا ہے۔

گٹکری

وہ پیچ دار آواز جو تان لگانے میں گلے سے لہرا کر نکلتی ہے۔ نیز تان لینے میں ایک خاص انداز سے سُر کا لہرانا جس کے لیے مہارت درکار ہوتی ہے۔

وہ تھی گٹکری یا لڑی نور کی
مسلسل تھی ایک پھلجھڑی نور کی
(میر حسن)

مرثیہ

وہ نظم یا اشعار جن میں کسی شخص کی وفات یا شہادت کا حال یا اس کے ساتھ اس کی مصیبتوں کا ذکر ہو۔ خاص طور پر وہ نظم یا اشعار جن میں حضرت امام حسینؑ اور دوسرے شہدائے کربلا کی مظلومی اور شہادت کے مصائب بیان کیے جائیں۔ یہ مرثیہ تحت اللفظ بھی پڑھا جاتا ہے اور تخت یا فرشی

نشست پر ہمنواؤں کے ساتھ یا تنہا لحن میں بھی پڑھا جاتا ہے۔

مرثیہ چننا

مرثیہ چننا سوز خوانوں کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کبھی کسی ایک ہی مرثیہ کے اور کبھی ایک بحر والے مختلف مرثیوں کے مکھی اور بیتیہ بند اس طرح ترتیب دیے گئے کہ وہ خود ایک مربوط اور مسلسل مرثیہ بن جائے۔ سوز خوانوں کا یہ عمل مرثیہ گویوں کے لیے شاید گراں رہا ہو لیکن مآلِ مجلس کی حد تک بے حد کامیاب رہا۔ اس طرح چنے ہوئے مرثیہ کو "چکیدہ" مرثیہ کہا جاتا ہے۔

مرثیہ خوانوں کا یہ عمل بتاتا ہے کہ وہ صاحبانِ علم ہوتے تھے۔ ان کی شاعرانہ بصیرت بھی غیر معمولی ہوتی تھی۔ کیوں کہ اس بصیرت کے بغیر الگ نوعیت کا مرثیہ مرتب کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔

مرثیہ خواں

مرثیہ پڑھنے والا اور اسے اپنے مستقل شغل کے طور پر اپنانے والا۔

کچھ میں شاعر تو نہیں مصحفی ہوں مرثیہ خواں
سوز پڑھ پڑھ کر محبوں کو رلا جاتا ہوں
(مصحفی)

مُرکی

چند سُروں پر مشتمل کلاسیکی اور ہلکی پھلکی موسیقی کی ایک سجاوٹ جسے بہت نرمی اور نزاکت کے ساتھ تیز لے میں ادا کیا جاتا ہے۔

تیرھواں باب

سوز خوانوں کے لیے چند ہدایات

سبط جعفر زیدی نے اپنی کتاب ''صوتی علوم وفنون اسلامی'' میں چند صفحات ''سوز خوانوں کے لیے چند ہدایات'' کے عنوان سے شامل کیے ہیں، ذیل میں نہ صرف ان صفحات کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے بلکہ جامعیت کے پیش نظر درمیان میں ڈاکٹر نیر مسعود اور آباد محمد نقوی زائر کے مضامین کے اقتباسات بھی شامل کیے جارہے ہیں۔

''خوش گلو اور خوش الحان ہونا یعنی خداداد صلاحیت ''آواز'' کے ساتھ ہی فنی مشق ومہارت یعنی ''ریاض'' ہر قسم کی صوتی ادائی کے لیے لازمی و بنیادی صفت وخصوصیت ہے تاہم سوز خوانی میں ایک اضافی شرط ''سوز دل'' بھی شامل ہے کہ کلام و پیغام کی پرسوز ومتاثر کن ادائی تب ہی ممکن ہے کہ جب آپ کلام کو دل کی گہرائی معانی ومفاہیم سے مکمل آگاہی اور جذباتی وابستگی اور بھرپور جوش عقیدت ومحبت کے ساتھ ادا کریں۔

ہر زبان اور ہر قسم کی عبارت والفاظ کو صحیح تلفظ اور مخارج گویا تجوید وقرأت کے اصولوں کے ساتھ ادا کرنے کی صلاحیت ہر قسم کے کلام کی ادائی کے لیے بنیادی ولازمی صفت ہے سوز خوانی چونکہ اردو زبان ہی سے متعلق ہے کہ جس میں عربی، فارسی اور دوسری زبانوں کے الفاظ واثرات بھی بہ کثرت پائے جاتے ہیں اس لیے سوز خواں کے لیے زبان وبیان کا لحاظ واہتمام زیادہ ہی ضروری ہوتا ہے۔

چونکہ سوز خوان کو کلام و بندش کے باہمی تعلق وتلازم کی روشنی میں ادائی کرنا ہوتی ہے اس لیے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ واقعات وشخصیات اور کلام کے پس منظر ومطالب سے آگاہی ضرور رکھتا ہو اس طرح اچھے سوز خواں کا مطالعہ تاریخ وادب ومذہب بھی اچھا ہونا چاہیے۔ اور اسے عام موسیقی راگ راگنی اور سروں کی زیادہ واقفیت ومہارت کی تو ضرورت نہیں ہے مگر کلام اور بندش کی ضرورت

تقاضوں اور تعلق سے آگاہی کے لیے سوز خوانی کے لیے موزوں سروں کی واقفیت اضافی مگر بنیادی شرط ہے تاکہ آلائش طرب کو علیحدہ کر کے سروں کو سوز کے دریا میں پاک کر کے کلام کی شایان شان ادائی کا حق اور فرض ادا کر سکے۔ اتنا اہتمام کسی دوسرے فن گائیکی وادائی یا صنف موسیقی کے لیے ضروری نہیں ہوتا۔ اسی طرح عام گائیکی وادائی کے برعکس سوز خوان کو چونکہ کومل اور تیور (سب سے نچلے اور اونچے) مدھم پنچم غرض یہ کہ ہر طرح کے سروں کو استعمال کرنا اور کام لینا ہوتا ہے اس لیے اسے اپنی آواز یعنی گلے کی صحت وسلامتی اور کارکردگی پر نظر رکھنا چاہیے اور معمولی سی خرابی کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ واضح رہے کہ ایک مکمل سوز خوان کو بیک وقت یعنی ایک ہی نشست بلکہ بعض اوقات ایک ہی کلام اور بندش کی ادائی میں نچلے اور اونچے سُروں کے علاوہ گلے، سینہ، ناک اور جبڑے سے کام لینا ہوتا ہے اور کوئی ساز یا ساؤنڈ سسٹم اس کا معاون ومددگار نہیں ہوتا بلکہ سوز خوانی نہایت سکون وخاموشی اور اطمینان کے ساتھ حاضرین وسامعین مجلس کے سامنے براہ راست پیش کی جاتی ہے اور ساز یا ماتم کے شور میں کسی خرابی یا خامی کو چھپایا دبایا نہیں جاسکتا۔ اس سلسلہ میں معالجین وطبی ماہرین مختلف ادویات علاج اور پرہیز تجویز کرتے ہیں تاہم ہر شخص اپنے مخصوص مزاج اور کیفیت کے مطابق ان ہدایات کو اختیار کرسکتا ہے بالعموم گلے کا استعمال اور کام کرنے والے ٹھنڈی (یخ) تلخ وترش (کھٹی) اور روغنی (یعنی زیادہ چکنائی اور چربی والی) اشیا سے پرہیز کرتے ہیں خصوصاً کھٹی اشیا (دہی، اچار، چٹنی) اور ٹھنڈا پانی تو قطعاً استعمال نہیں کرتے جبکہ نزلہ زکام، کھانسی اور راتوں کو مسلسل جاگتے رہنے سے بھی گلے اور آواز پر مضر اثرات ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں انھیں تمباکو نوشی سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔ سوز خوان کو زیادہ سے زیادہ دیر تک سانس روکنے اور ایک ہی مسلسل آواز میں مختلف سُروں کی آس (آکار) کی مشق بھی کرنا ضروری ہے کہ اگر آپ کا اسٹیمنا کم ہوگا تو شاید آپ پورے مصرع اور بندش کو ایک سانس میں ادا نہ کرسکیں اور بعض اوقات یہ ضروری ہوتا ہے اور غلط جگہ توڑ دینے سے معانی بدل یا الٹ جاتے ہیں جیسے حضرت نجم آفندی مرحوم کے ایک مشہور سلام کا مصرع غلط جگہ توڑ دینے سے معنی تبدیل ہوجاتے ہیں اور سننے والا پریشان ہوجاتا ہے۔

"اپنی طرف سے چھیڑ نہ، اپنی طرف سے جنگ"

یہ مسلک حسین علیہ السلام ہے!

جبکہ یہ مصرع یوں ادا کیا جانا چاہیے

"اپنی طرف سے چھیڑ، نہ اپنی طرف سے جنگ" اس طرح غلط جگہ توڑنے سے چھیڑ نہ کی بجائے چھیڑنا سننے میں آتا ہے[1]

یا یہ مصرع ملاحظہ فرمائیں۔

ٹوٹے تھے سب رسولؐ کے پیارے حسین پر

اس مصرع کی اصل قرأت یوں ہوگی

ٹوٹے تھے سب۔ رسولؐ کے پیارے حسین پر

لیکن اگر اسے یوں پڑھا جائے

ٹوٹے تھے سب رسولؐ کے پیارے۔ حسین پر

تو معنی کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں[2]

آباد محمد نقوی زائر نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا کہ:

"شاعر آل محمد نسیم امروہوی کے ایک مرثیے کے مطلع کا دوسرا مصرع یہ ہے "زینب بھی رو سکی نہ محرم میں اس طرح" اس مصرع کو پڑھنے والے سوزخوان نے لفظ "نہ" غلط مقام اس طرح پڑھا "زینب بھی رو سکی نہ، محرم میں اس طرح"۔ رو سکی کے ساتھ نہ پڑھنے سے "سکینہ" سمجھ میں آیا یا سننے میں آیا۔ "نہ" کا تعلق "محرم میں اس طرح" سے ہے، غلط جگہ لفظ "نہ" کو پڑھنے سے سننے کی حد تک مہمل ہو گیا"[3]

ایک اور مصرع ملاحظہ فرمایئے۔

"بے چین تھی صغریٰ جو فراق پدری سے"

اب اگر اسٹیمنا نہ ہو اور آواز پر کنٹرول کمانڈ نہ رہے تو اس کی ادائی اور ابلاغ بڑے بڑے وقفوں اور اوقاف کے بعد یوں ہوتا ہے۔

بے ے چے اے ے این تھی صغرا جو فرا آ ق اے ے پد

ری ی ای ی سے اے ے اے ے اے ے اے ے۔ ظاہر ہے کہ جتنا بڑا سانس ہوگا اسی تسلسل و تواتر و اتصال کے ساتھ صحیح طور پر ابلاغ ہو سکے گا۔ اور حرف لفظ بھی نہ ٹوٹنے پائے اور

---

[1] صوتی علوم فنون اسلامی، سبط جعفر زیدی، سید اینڈ سید، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص: ۱۰۸ تا ۱۱۰

[2] مرثیہ خوانی کا فن، ڈاکٹر نیر مسعود، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء، ص: ۱۲۷

[3] میراثاثہ، سید آباد محمد نقوی زائر، کراچی، ۲۰۰۵ء، ص: ۸۰

بندش بھی غیر ضروری طور پر منقطع یا معطل و منفصل نہیں ہونا چاہیے۔ سوز خوان کو چاہیے کہ وہ تمام اجزا وعناصر سوزخوانی کی واقفیت ومہارت حاصل کرے یعنی رباعی قطعہ سوز بین سلام مرثیہ سب کچھ تن تنہا بھی ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور بازوؤں کو بھی متبادل تیار کرے بازوؤں کا اہتمام بھی آداب و لوازمات سوزخوانی میں سے ہے بہتر ہے کہ ہم عمر یا نو عمر قریبی اعزہ اور ذاتی حلقہ اثر کے افراد کو جو صلاحیت اور شوق رکھتے ہیں بازو بنایا جائے بہر حال "آس" کا نظام وانتظام بھی رباعی قطعہ اور سوز و سلام کی حد تک ضرور رکھے اس کے بغیر سوزخوانی میں رونق اور کشش پیدا نہیں ہوتی۔

سوز خوان کے لیے ضروری ہے کہ وہ بیاض و بستہ کا بھی اہتمام کرے اگرچہ اساتذہ اور روایت پسند حضرات قطعات رباعیات اور سوز کے لیے علیحدہ، سلام و بین کے لیے علیحدہ اور مراثی کے لیے علیحدہ یعنی کم از کم تین مجامیع رکھتے ہیں جنھیں سیاہ جزدان میں ادب واحترام اور اہتمام کے ساتھ رکھا جاتا ہے تاہم کم از کم ایک ہی بڑی بیاض میں ان سارے کلام کو تین حصوں میں تحریر کر کے اس کے اشاریہ کے ساتھ تحریر کرنا چاہیے اور اس سرمایہ کی ایک سے زائد نقول یا نسخہ (بازوؤں کے پاس بھی) موجود و محفوظ ہونا چاہیے۔ کلام کے انتخاب میں احتیاط برتنی چاہیے اور صرف اساتذہ و مستند شعرا ہی کا کلام پڑھنا چاہیے اس ضمن میں بزرگ سوزخوانوں یا بازار میں دستیاب معیاری مجامیع سے بھی انتخاب کیا جاسکتا ہے بہتر ہے کہ خود شاعر یا کسی ذی علم انسان سے کلام کی ادائی وصحت الفاظ یعنی درست تلفظات کی تصدیق وتوثیق کرالی جائے اس طرح اگر کوئی غلطی طباعت کلام یا ادائی میں ہوئی تو خلوت وتنہائی میں ایک ہی فرد کے سامنے درست ہو جائے گی اور اس غلطی و ناواقفیت کا علم ایک ہی شخص کو ہوگا جبکہ مجلس میں وہ غلطی ہزاروں افراد پر سوز خواں کی کم علمی کو آشکار کردے گی مثلاً آپ نے بیشتر معروف سوزخوانوں سے سنا ہوگا جو جناب سیدہ کی شہادت سے متعلق مرثیہ "جب خلق سے وقت سفر فاطمہ آیا" کے ایک مصرع شبیر کو میرے، نظر بد سے بچانا کو اس طرح پڑھتے رہے ہیں شبیر کو میری نظر بد سے بچانا (معاذ اللہ)۔ بلکہ اگر کسی شاعر کی بھی غلطی ہو تو اس سے پرہیز یا ضروری اصلاح وترمیم کرالینا چاہیے (کسی معتبر و مستند شاعر سے نہ کہ از خود)۔

یہ بانی مجلس کا فریضہ ہے کہ وہ مجلس کے اعلان واشتہار میں سوزخوان کے نام کی بھی تشہیر کرے پابندیٔ وقت کا خیال رکھے، سوزخوان کی پذیرائی اور آمدورفت کا خیال رکھے تاہم سوز خوان کو از خود اس قسم کی توقع نہیں کرنا چاہیے کہ اصل جزا اور حقیقی اجر وثواب انھیں بارگاہ ایزدی و

دربار معصومین ہی سے ملتا ہے ان کے خزانہ میں کمی ہے نہ اندھیر۔ نہ ہی وہ کسی کا احسان رکھتے ہیں نہ نیکوکاروں کا اجر ضائع کرتے ہیں بلکہ دونوں جہانوں میں خوب خوب نوازتے ہیں بس ذرا صبر اور توکل وقناعت کی ضرورت ہے۔

سوزخوان کو چاہیے کہ وہ مناسب لباس وضع قطع اور اچھے اطوار کو اختیار کرے کہ اس کا منصب اور مقام ومرتبہ اور مومنین کی اس کے بارے میں حسن عقیدت بھی اس سے مثالی کردار کی توقع رکھتی ہے یعنی دنیاوی طور پر بھی اسے اچھا سچا مسلمان اور مثالی انسان ہونا چاہیے ویسے بھی اچھا انسان ہی اچھا فن کار اور سچا مسلمان ہوسکتا ہے۔

سوزخوان کو آداب نشست وبرخاست کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے تخت، تکیہ یا مائک اور مومنین کے سامنے بیٹھنے کے بعد گنگنانا بھنویں یا ہاتھ چلانا غیر ضروری طور پر دائیں بائیں دیکھنا اور سوزخوانی کے درمیان غیر ضروری طور پر باتیں یا تقریر کرنا بار بار نعرہ صلوٰۃ کہنا لوگوں کو زبردستی داد وتحسین یا گریہ وبکا کی دعوت دینا زانو سینہ یا ہاتھ پاؤں کو ڈرامائی طور پر پیٹنا یہ سب آداب مجلس اور سوزخوان کے وقار کے بھی منافی ہے۔ سوزخواں کو چاہیے کہ وہ اپنے بازوؤں کا احترام کریں اور ان کی عزت نفس کا خیال رکھیں خود بھی عزت کریں دوسروں سے بھی کرائیں اور دوران مجلس تنبیہ وتادیب نہ کیا کریں۔ یہ ایک نامناسب طرز عمل ہے۔

سوزخوان کو احتیاطاً مقررہ وقت سے بھی کچھ پہلے پہنچنا چاہیے کہ وہ ذاکر اول ہوتا ہی اس کی موجودگی سامعین اور خصوصاً بانی مجلس کے لیے تقویت وطمانیت کا باعث ہوتی ہے ایصال ثواب کی مجلس میں اسے قرآن خوانی میں بھی حصہ لینا چاہیے اور کوئی دوسری مجلس یا اہم مصروفیت نہ ہوتو سوزخوانی کے بعد مجلس میں بھی شرکت کرنا چاہیے۔ رخصت ناگزیر ہوتو ذاکر اور بانی مجلس کی اجازت ورخصت، وضاحت اور معذرت بھی اچھی عادت وروایت سمجھی جاتی ہے۔

بعض اوقات حصول برکت کے لیے یا کسی وجہ سے ذاکر کی آمد میں تاخیر کی وجہ سے بھی سوزخوانی سے پہلے حدیث کساء اور بعد میں سلام کی ضرورت پیش آجاتی ہے ایسے آڑے وقت میں مجلس کی تنظیم وترتیب کو برقرار رکھنے کے لیے سوزخوان کو چاہیے کہ وہ حدیث کساء کی تلاوت اور سلام پڑھنے کی تیاری وآمادگی رکھتا ہو اس لیے کہ سوزخوانی کو نظریہ ضرورت کے تحت غیر ضروری طول دینے سے اس کا حسن وتوازن اور تاثر مجروح ومتاثر ہوتا ہے کیا ہی اچھا ہو جو سوزخواں مرثیہ

تحت اللفظ نوحہ اور زیارت پڑھنے پڑھانے کی بھی اضافی صلاحیت رکھتا ہو۔

بہتر ہے کہ سوز خواں ایک وقت اور پہر میں ایک ہی وعدہ کرے اس لیے کہ بانیان مجالس بصد اصرار پابندیٔ وقت کی یقین دہانی اور تاکید تو کراتے ہیں مگر بوجوہ عمل درآمد میں ناکام رہتے ہیں یوں مہلت نہ ہونے کی وجہ سے بعض اوقات کئی یا کوئی ایک مجلس متاثر ہوتی ہے جو بدنظمی و بدمزگی کا باعث ہوتا ہے۔ ویسے اس سلسلہ میں بالعموم کوتاہی بانی مجلس کی طرف سے ہوتی ہے مگر خمیازہ سوز خوان کو بھگتنا پڑتا ہے۔

سوز خواں کو مجلس اور مخصوصی کا بھی خیال رکھنا چاہیے ضروری نہیں ہے کہ تمام اجزا اور عناصر پر مشتمل مکمل سوز خوانی (نصف گھنٹہ پر مشتمل) لازمی طور پر کی جائے ذاکر اور صورت حال کی موزونیت و مناسبت کو بہر حال ملحوظ رکھنا چاہیے اس کے لیے قطعہ رباعی سوز یا سلام میں سے کسی بھی رکن کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے علاوہ ازیں مرثیہ کا بھی انتخاب اس طرح ہو کہ اس میں اختصار یا طوالت و تفصیل کی گنجائش موجود ہو تاکہ حسب ضرورت سمیٹا یا پھیلایا جا سکے اور بانی مجلس کو ختم کرنے کے لیے اشارہ یا پرچہ کی ضرورت نہ پڑے یا اگر مرثیہ کے دوران اسے ہدایت موصول ہو کہ "مولانا ابھی نہیں آئے ذرا طول دے دیں" تو مرثیہ (سوز خوانی) خراب کرنے یا غیر ضروری طول دے کر اسے بے کیف و بے مزہ کرنے کی بجائے سوز خواں مرثیہ کو مقررہ اصل مقام پر ختم کر کے منبر پر سلام پڑھ کر اس وقفہ یا خلا کو پر کر دے اس ضمن میں ممدوح کا خیال رکھے یعنی مخصوصی کی مناسبت سے کلام خصوصاً مرثیہ کا انتخاب کرے ایسا نہ ہو کہ شہادت اور مجلس تو جناب سیدہ کی ہو اور کلام خصوصاً حضرت علی اکبر کا پڑھا جا رہا ہو۔ بلکہ ایصال ثواب کی مجالس میں بھی ایام یا مرحوم کی مناسبت سے بیان مصائب اور مرثیہ کا انتخاب کیا جاتا ہے مثلاً خاتون جنت کا مرثیہ اور جوان کے ایصال ثواب کی مجلس ہے تو کربلا کے کسی جوان کا مرثیہ۔ جہاں تک ایصال ثواب سے متعلق مجالس کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں نہایت احتیاط اور خصوصی اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے بھی کہ ایسے اجتماعات اور مجالس ترحیم و تعزیت میں ذاتی تعلق کے حوالہ اور مروت و دنیاداری کے تحت غیر اقوام کے افراد اور ہم عقیدہ غیر مجلسی افراد بھی شرکت کرتے ہیں جنھیں مجالس اور اس قسم کے اجتماعات میں شرکت و سماعت اور سوز خوانی و خطابت کا کوئی تجربہ یا سابقہ نہیں ہوتا اور ان کا مشاہدہ و تجربہ سو فیصدی اسی مجلس پر مبنی ہوتا ہے جس میں وہ اتفاقاً یا مروتاً شریک ہو گیا ہے اب اگر اسے کوئی معیاری و معقول اور متاثر کن کلام و بندش سننے کو ملے گی تو اس کا

تاثر خوش گوار ہوگا اور مزید تحریک و ترغیب اور تشویق کا باعث بنے گا بصورت دیگر اس کے احساسات و تاثرات برعکس یعنی منفی ہوں گے یوں بھی سوز خوانی میں اختلافی، متنازع، مناظرانہ یا ضعیف روایت اور غیر معیاری کلام و بندش کو رسوخ و نفوذ حاصل نہیں ہے۔ سوز خواں کو نہ صرف حاضرین و سامعین مجلس بلکہ ان بظاہر غیر موجود سامعین پر بھی نظر رکھنا چاہیے جو آواز کے دوش پر یا کیسٹ، سی ڈی اور یوٹیوب کے توسط سے اس کے دائرۂ سماعت میں آتے ہیں۔

سوز خوان کو چاہیے کہ وہ اپنی ڈائری یا نوٹ بک میں اپنی مجالس کے ساتھ یہ بھی ریکارڈ اور اندراج رکھے کہ اس نے کب کہاں کیا پڑھا؟ تاکہ جب اسی اجتماع یا مخصوصی میں دوبارہ جائے تو پرانا ہی کلام نہ دہرا دے کہ جو لوگ باقاعدہ اہتمام کرتے اور ریکارڈ رکھتے ہیں انھیں بڑی مایوسی ہوتی ہے جس سے سوز خواں کا مقام و مرتبہ متاثر ہوتا ہے۔ سوز خوان کو چاہیے کہ کلام اور بیاض کو سامنے رکھے تاکہ توجہ کا مرکز و محور کلام ہی ہو اور ادائی پر یکسوئی سے توجہ دی جا سکے۔

بازوؤں کو چاہیے کہ وہ آس کو اس طرح مربوط و مسلسل رکھیں کہ دوران کلام سکتہ یا وقفہ اور تعطل نہ ہونے پائے اسی طرح قریب ترین بازو جسے جانشین اور نائب کا مرتبہ حاصل ہو اس طرح سوز خوان کی ادائی سے متصل اور قریب تر ہو کہ اگر سوز خوان کی آواز یا ادائی میں کوئی خلل یا نقص واقع ہو جائے تو کلام نہ ٹوٹنے پائے اور وہ کسی وقفہ سکتہ تعطل یا خرابی سے پہلے اسے سنبھال سکے۔ اسی طرح مرثیہ کی روانی اور بہاؤ میں بعض اوقات اریا اور کا انداز نہیں ہو پاتا اور غلط ادائی سے کلام اور بندش کا وزن، بحر لحن اور توازن بگڑنے اور ٹوٹنے کا خدشہ رہتا ہے چنانچہ اس کی نشاندہی و ادائی کے لیے "اوور" کو مد کے ساتھ "آور" کی شکل میں جبکہ "اُر" کو "اور" کی شکل میں تحریر کر لینا چاہیے اسی طرح مدینہ اور مدینے کا لحاظ بھی رکھنا چاہیے "ہ" "یا" "ے" میں سے جو پڑھنا ہو وہی لکھنا چاہیے۔ اگرچہ ان لوازمات و خصوصیات کا لحاظ و اہتمام تمام اصناف و اقسام گائیکی و ادائی میں مفید و موثر سمجھا جاتا ہے تاہم سوز خوانی کے لیے بے حد ضروری اور بنیادی ہے۔

بعض اوقات کسی غلط فہمی یا بدانتظامی کی وجہ سے ایک سے زائد سوز خوانوں کو مدعو کر لیا جاتا ہے۔ ایسے موقع پر کسی بدمزگی، مایوسی یا شرمندگی سے بچنے کے لیے سوز خوانی کے مقررہ وقت میں کلام کو اور وقت کو مناسب طور پر تقسیم کر لینا چاہیے۔ مثلاً پہلا سوز خوان قطعہ رباعی سوز اور سلام پڑھ لے اور دوسرا ایک سوز پڑھ کر مرثیہ پڑھ دے تاکہ کوئی محروم نہ رہے۔[۱۲]

---

[۱۲] صوتی علوم و فنون اسلامی، سبط جعفر زیدی، سید اینڈ سید کراچی، ص: ۱۱۰ تا ۱۱۴

چودھواں باب

ہندوستان میں سوزخوانی کے زوال کے اسباب

ڈاکٹر سید سکندر آغا نے اپنی کتاب ''سوزخوانی: تاریخ و تذکرہ'' میں ہندوستان میں سوزخوانی کے زوال کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اگر تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو معلوم ہوگا کہ کتنی عظیم الشان سلطنتیں، کتنے عالی شان محل، کیسی باوقار اور اولوالعزم ہستیاں پیدا ہوئیں جنھوں نے اپنے کارہائے نمایاں سے بلند مقام حاصل کیا لیکن آج نہ وہ سلطنتیں، نہ وہ محل اور نہ وہ ہستیاں ہیں۔ البتہ اُن کے نام تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ دنیا میں ایک فن کے بعد دوسرا فن اور ایک فن کار کے بعد دوسرا فن کار پیدا ہوا جس نے اپنے فن کے جو نقوش چھوڑے وہ آج بھی تازہ واردان بساط کے لیے مشعل راہ بن کر رہنمائی کر رہے ہیں۔ مشہور سوزخوان محمد وقیع کا ارشاد ہے:

''۱۹۱۴ء کی عالمی جنگ سے کچھ گرانی بڑھی اور بعد میں ۱۹۳۹ء ہٹلر کی عالمی جنگ شروع ہوئی اور گرانی اور زیادہ بڑھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ۔ امیر و غریب سب متاثر ہوئے۔ نوکری پیشہ حضرات کی تنخواہیں وہی رہیں اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا گیا اُس کے اثرات سوزخوانی پر منتج پڑے۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان تقسیم ہوا۔ بعد میں زمیں داریاں ضبط ہوئیں۔ بڑھتی ہوئی گرانی نے سب کو جھنجھوڑ ڈالا۔ روسا جو فن سوزخوانی کے قدرداں تھے ان کی آمدنیاں کم ہوگئیں اس لیے وہ حضرات بھی اپنے اخراجات کم کرنے پر مجبور ہوگئے اور بہت سے سوزخوانوں کو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اب بچے ہوئے گنتی کے سوزخواں رہ گئے جو ایام عزا میں مذہبی رسوم ادا کرنے لگے۔ سوزخواں حضرات بھی اِس اقتصادی کشمکش سے نہ بچ سکے ان کو روٹی روزی کی فکر لاحق

ہوئی۔ گرانی نے ان کو چُور چُور کر دیا۔ ان کے بچوں کے پاس کالج یا یونیورسٹی کی ڈگریاں تو تھی نہیں کہ کہیں ملازم ہو جائیں۔ وہ بیچارے تلاش معاش میں سرگرداں و پریشاں رہے اور کسی دوسرے کام دھندے میں مصروف ہو گئے۔ ایسی صورت میں وہ کس طرح سوزخوانی کے فن کو سیکھیں۔

تقسیم کے بعد اچھے اچھے سوزخوان نے پاکستان ہجرت کی۔ کچھ پاکستان چلے گئے اسی طرح کچھ ایسے رؤسا جو فن موسیقی سے واقف تھے اور سوزخوانی کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کی ہمیشہ ہمت افزائی کرتے تھے اور مالی تعاون سے امداد پہنچاتے رہتے تھے وہ بھی پاکستان ہجرت کر گئے۔ سرزمین اودھ جہاں یہ فن بام عروج پر پہنچا تھا دونوں طرح کے لوگوں سے خالی ہو گیا۔ ایسی صورت میں زوال آنا لازمی تھا۔

سنیما نے تو عام لوگوں کے مزاجوں کی کیفیت ہی بدل ڈالی ہے۔ ہندوستانی شاستری سنگیت جس پر فن سوزخوانی کی بنیاد تھی اس کو لوگ بھول رہے ہیں فیچر فلمیں دیکھ کر نوجوان طبقہ چاہے سوزخوانوں کے خاندان سے کیوں نہ ہو مغربی موسیقی ڈسکو ڈانس کی دھنیں پسند کرتا ہے۔ کلاسیکل موسیقی پر وہ دھیان نہیں دیتا تو یہ بتایئے کہ سوز خوانی کے نشیب وفراز اتار چڑھاؤ کس طرح یاد کر سکتا ہے۔ ٹی وی موجودہ زمانے کی بہترین ایجاد ہے اس پر بھی ہندی فیچر فلمیں شوق سے دیکھی جاتی ہیں اور اگر کبھی کلاسیکل موسیقی کا پروگرام ہو تو اس کو نہیں سنتے۔ سوزخوانوں کے بچوں کا جن کی عمریں سوز سیکھنے کی ہیں ان کا بھی یہی حال ہے اس کے اثرات فن سوزخوانی پر منفی ہوتے ہیں اس فن کے جاننے والے حضرات یہ نہیں پسند کرتے کہ اُن کے گھر کا فن کسی غیر شخص کو پہنچے۔ وہ اپنے گھر کے فن کو اپنے گھر ہی تک محدود رکھنا چاہتے ہیں اس لیے اپنی اولادوں یا اپنے قریبی عزیز یا رشتہ داروں ہی کو سکھاتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ وہ فن اُن کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن ہو جاتا ہے"۔

محمد وقیع کے درج بالا بیان سے کسی حد تک فن سوزخوانی کے زوال کے اسباب کا پتہ چلتا ہے لیکن جہاں تک سوال علماء اور ذاکرین کا ہے انھوں نے بھی اس کی مخالفت زور و شور کے ساتھ کی۔ کچھ نے کہا کہ اس میں راگ / راگنی کی شمولیت ہوتی ہے اس لیے اس کا سننا اور اس پر دھیان دینا حرام ہے۔ علماء کے اس مشورہ پر بہت سے سیدھے سادے مسلمانوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کی جس سے فن سوزخوانی کو نقصان پہنچا۔

ڈاکٹر سکندر آغا نے سبط جعفر زیدی کا یہ بیان بھی نقل کیا ہے کہ ''عہد حاضر کے نووارد سوزخوانوں کو چاہیے کہ وہ کسی بھی مستند سوزخواں یا تعلیم یافتہ شخص کو رہنما بنا کر پرانے سوزخوانوں یا موجودہ سوزخوانوں کے کلام کو یاد کر کے دُہرا کر اس سلسلہ کو جاری رکھیں، چھوٹی چھوٹی گھریلو مجلسوں کو فوقیت اور اہمیت دیں یہاں نسبتاً زیادہ خلوص محبت اور رکھ رکھاؤ ہوتا ہے۔ جس طرح کتاب پڑھ کر ترکیب استعمال جان لینے اور محض گراؤنڈ میں پریکٹس کر لینے سے ڈرائیونگ مہارت پیدا نہیں ہو سکتی اسی طرح کتابی باتوں یا سنی سنائی باتوں سے سوزخوانی کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ کتابی علم اور ابتدائی تیاری کے بعد مشق و مہارت سے خود اعتمادی اور خود اعتمادی سے استادی پیدا ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لیے جب تک آپ مجلس میں سوزخوانی نہیں کریں گے آپ میں خود اعتمادی اور قدرت و مہارت پیدا نہیں ہو سکتی۔ چھوٹی چھوٹی گھریلو مجالس عملی مشق و ریاض کے لیے بہترین تربیت گاہیں اور تجربہ گاہیں ہوتی ہیں۔ کسی ساز یا بند کمرہ کا ریاض آپ کو مجلس کی سوزخوانی کا ماہر نہیں بنا سکتا۔ اس ضمن میں ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جو لوگ گھریلو کم نفری یعنی باعتبار سامعین و باعتبار پذیرائی چھوٹی مجلسوں کو اہمیت نہیں دیتے تو ایسے لوگوں کو بڑی مجلس والے اہمیت نہیں دیتے اس طرح بھی فن سوزخوانی کو نقصان پہنچتا ہے''۔

ڈاکٹر سکندر آغا لکھتے ہیں:

''ان باتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے ہم کو چاہیے کہ ہم سنجیدگی سے غور کریں اور دیکھیں کہ ابھی بھی وقت ہے کچھ باہمت اور باحوصلہ افراد کھڑے ہو جائیں۔ اس فن کو برقرار رکھنے کے لیے لوگوں کو متوجہ کریں۔ مجالس عزا کا آغاز فن سوزخوانی سے کریں، فن موسیقی سے دلچسپی رکھنے والے زیادہ سے زیادہ اس فن کو حاصل کر کے اس کی تبلیغ کریں، امید ہے کہ ڈوبتی ہوئی کشتی کو سہارا مل جائے اور یہ فن فنا ہونے سے بچ جائے''[1]

---

[1] سوزخوانی تاریخ و تذکرہ، ڈاکٹر سید سکندر آغا، لکھنؤ، ص: ۲۹۳تا۲۹۶ (تلخیص)

کتابیات

☆ محمد علی خان۔ تذکرہ ذاکرین۔ مشیر عالم پریس، حیدرآباد دکن۔ ۱۳۶۱ھ (۱۹۴۲ء)
☆ سید سکندر آغا، ڈاکٹر۔ سوز خوانی، تاریخ و تذکرہ۔ ڈاکٹر سید سکندر آغا لکھنؤ۔ ۱۹۹۹ء
☆ سبط جعفر زیدی۔ صوتی علوم و فنون اسلامی۔ سید اینڈ سید کراچی۔ ۱۹۹۵ء
☆ سید افضل حسین ثابت رضوی لکھنوی۔ حیات دبیر۔ مولوی غلام عباس تاجر کتب، لاہور۔ ۱۹۱۳ء
☆ اسد اریب، ڈاکٹر۔ لغات العزا۔ (غیر مطبوعہ)
☆ انجم شیرازی۔ مبادیات موسیقی۔ اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۵ء
☆ نسیم امروہوی۔ چشمہ غم۔ انجمن سوز خوانان، کراچی۔ ۱۳۸۸ھ
☆ ماجد رضا عابدی۔ کرب کربلا۔ سانہ آفتاب میموریل فاؤنڈیشن، کراچی۔ ۲۰۱۵ء
☆ سبط جعفر زیدی۔ بستہ۔ ادارہ ترویج سوز خوانی، کراچی۔ ۲۰۰۰ء
☆ اسد اریب، ڈاکٹر۔ اردو مرثیے کے نئے صنعت گر۔ کتاب نگر، ملتان۔ سن ندارد
☆ شارب ردولوی، ڈاکٹر۔ اردو مرثیہ۔ اردو اکادمی، دہلی۔ ۱۹۹۱ء
☆ علی جواد زیدی۔ دہلوی مرثیہ گو۔ نفیس اکیڈمی، کراچی۔ ۱۹۸۸ء (حصہ اول)
☆ اسد اریب، ڈاکٹر۔ اردو مرثیے کی سرگزشت۔ کاروان ادب، لاہور۔ ۱۹۸۹ء
☆ نیر مسعود، ڈاکٹر، مرثیہ خوانی کا فن، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ۔ ۱۹۹۰ء
☆ مسیح الزماں، ڈاکٹر۔ اردو مرثیے کا ارتقا، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ۔ ۱۹۹۳ء (دوسرا ایڈیشن)
☆ عبدالحلیم شرر۔ گزشتہ لکھنؤ۔ لکھنؤ۔ ۱۹۷۴ء۔
☆ مرزا ہادی رسوا۔ امراؤ جان ادا۔ خزینہ علم و ادب، لاہور۔ ۲۰۰۰ء۔
☆ سید آغا مہدی۔ تاریخ لکھنؤ، جمعیت خدام عزا، کراچی۔ ۱۹۷۶ء۔
☆ مرزا جعفر حسین۔ قدیم لکھنؤ کی آخری بہار، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔ ۱۹۸۱ء۔
☆ سید صفدر حسین، ڈاکٹر۔ لکھنؤ کی تہذیبی میراث، بارگاہ ادب، لاہور۔ ۱۹۷۵ء۔
☆ سید اسرار حسین خان۔ قدیم ہنر و ہنرمندان اودھ۔ سرفراز قومی پریس، لکھنؤ۔ ۱۹۳۶ء۔

☆ سید ظہور حیدر رضوی جارچوی۔ شعور سوز و مرثیہ، لاہور۔ سن ندارد۔
☆ اقبال حسن کاظمی (مرتب)۔ اردو زبان اور اردو مرثیہ فاؤنڈیشن، کراچی۔ ۲۰۱۸ء۔
☆ اکبر حیدری کشمیری، ڈاکٹر۔ ہندو مرثیہ گو شعرا، شاہد پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ ۲۰۰۳ء۔
☆ سید آباد محمد نقوی (زائر امروہوی)۔ میرا اثاثہ، کراچی۔ ۲۰۰۵ء۔
☆ سید عاشور کاظمی، اردو مرثیے کا سفر۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۶ء۔
☆ سید اصغر علی شادانی، احوال ریاست رام پور، تنظیم احباب رامپور (پاکستان)، کراچی، ۲۰۰۶ء۔
☆ منظور حسنین آرزو، عزاداری امروہا، ہمارا مذہبی ورثہ، کراچی، ۲۰۱۷ء۔
☆ ضمیر اختر نقوی، اردو مرثیہ پاکستان میں، سید اینڈ سید، کراچی، ۱۹۸۲ء۔
☆ منشی محمد اکرم امام خان، معدن الموسیقی، ہندوستانی پریس، لکھنؤ، ۱۹۲۵ء۔
☆ حسین عارف نقوی، برصغیر کے امامیہ مصنفین کی مطبوعہ تصانیف اور تراجم (دو جلدیں)، مرکزی تحقیقات فارسی ایران، پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء۔
☆ فرحان رضا، تحت اللفظ خوانی، ایک فنی مطالعہ، ناشر نا معلوم، کراچی، ۲۰۱۳ء۔

جرائد

☆ کتاب کربلا۔ (ادبیات کربلا نمبر)، تنظیم المکاتب، لکھنؤ۔ ۱۹۹۳ء۔
☆ ماہنامہ شب خون۔ الہ آباد۔ نومبر ۲۰۰۲ء
☆ ماہنامہ صدائے جعفریہ (عزاداری نمبر)، حیدرآباد (دکن) سن ندارد
☆ ہفت روزہ ارشاد، کراچی، ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۱ء تا ۳ نومبر ۱۹۶۱ء
☆ ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ (اودھ نمبر)، فروری، مارچ ۱۹۹۴ء۔
☆ ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ۔ جون ۱۹۹۷ء۔
☆ ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ۔ اکتوبر ۲۰۱۷ء۔
☆ ماہنامہ انشا، کراچی۔ جون ۱۹۶۲ء۔
☆ سہ ماہی رثائی ادب، کراچی۔ مکمل فائل، ۱۹۹۶ء تا ۲۰۱۳ء۔
☆ بعد قتل شاہ (مجلہ انجمن فدائے اہل بیت)، کراچی۔ ۱۹۹۰ء۔
☆ روزنامہ صحافت (محرم نمبر) لکھنؤ، ۲۰۲۰ء۔

پاکستان کے نامور سوز خواں

تالیف

عقیل عباس جعفری

ان شاء اللہ جلد شائع ہو رہی ہے

التماس سورۂ فاتحہ

برائے ایصال ثواب

سید وزیر حسن جعفری

ابن

سید ظہور الحسن جعفری

سیدہ مسعودہ خاتون جعفری

بنت

سید یوسف حسین جعفری

سیدہ قمر زہرا جعفری

بنت

سید وزیر حسن جعفری

سیدہ ممتاز زہرا جعفری

بنت

سید وزیر حسن جعفری

و

جملہ مومنین و مومنات و شہدائے ملت

دعا فرمایئے کہ

پروردگار عالم چہاردہ معصومینؑ کے صدقے میں

مرحومین کے درجات بلند فرمائے

اور انکو جوار آئمہ معصومینؑ میں جگہ عطا فرمائے

اور ان کی تمام لغزشوں اور کوتاہیوں کو درگزر فرمائے

عقیل عباس جعفری کا نام تحقیق کے شعبے میں نیا نہیں۔

پاکستان کی ماہ بہ ماہ تاریخ پاکستان کرونیکل اور بیسویں صدی کا سال بہ سال جائزہ بیسویں صدی سال بہ سال ان کے تحقیقی کارناموں میں سرفہرست ہیں۔ سیاست کے موضوع پر ان کی پہلی کتاب "پاکستان کے سیاسی وڈیرے" تھی جس نے شائع ہوتے ہی تہلکہ مچا دیا۔ یہی وہ کتاب تھی جس نے سیاست کی دنیا میں "سیاسی وڈیرے" کی اصطلاح کو متعارف کروایا۔ "پاکستان کے سیاسی وڈیرے" کے علاوہ عقیل عباس جعفری نے سیاست ہی کے موضوع پر کئی اور کتابیں بھی لکھیں جن میں پاکستان کی ناکام سازشیں، پاکستان کی انتخابی سیاست، قائداعظم کی ازدواجی زندگی، لیاقت علی خان قتل کیس اور پاکستان کا قومی ترانہ: کیا ہے حقیقت؟ کیا ہے فسانہ؟ شامل ہیں۔ انھوں نے موسیقی کے موضوع پر لکھے گئے شاہد احمد دہلوی کے نادر و نایاب مضامین کا مجموعہ مضامین موسیقی بھی سردار جعفری: شخصیت اور فن، میر باقر علی داستان گو: داستانیں اور داستان گوئی، عصمت چغتائی کے خاکوں کا مجموعہ چراغ روشن ہیں اور عرفان صدیقی کی شاعری کی کلیات سخن آباد کے نام سے مدون کیے جو اشاعت پزیر ہو چکے ہیں۔

عقیل عباس جعفری کا شمار اپنی نسل کے نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "تعلق" کے نام سے اشاعت پذیر ہو چکا ہے جبکہ نعتیہ شاعری کا مجموعہ "تر و تازہ" اور رثائی شاعری کا مجموعہ "فرشِ عزا" کے نام سے زیر اشاعت ہیں۔

عقیل عباس جعفری ۲۰۱۶ء سے ۲۰۱۹ء تک اردو لغت بورڈ، کراچی سے بطور مدیر اعلیٰ وابستہ رہے اس دوران انھوں نے ۲۲ جلدوں پر مشتمل اردو کی اس عظیم الشان لغت کا ڈیجیٹل ورژن تیار کیا اور اسے انٹرنیٹ کے ذریعے پوری دنیا تک پہنچانے کا کارنامہ انجام دیا۔ انھوں نے اس عظیم لغت کی دو جلدوں میں تلخیص بھی تیار کی اور اسے سی ڈی کی شکل میں بھی محفوظ کیا۔

تحقیق اور پاکستانیات کے شعبے میں ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر پاکستان کوئز سوسائٹی نے انھیں ۲۰۰۴ء میں کوئز ایکسیلینس ایوارڈ، وزڈم پاکستان فورم نے ۲۰۱۰ء میں ہیروز آف پاکستان کمال کارکردگی ایوارڈ، سینٹر آف سوک ایجوکیشن پاکستان نے ۲۰۱۰ء کا سوک ایجوکیشن ایوارڈ اور اے پی این ایس نے ۲۰۱۱ء کے بہترین فیچر نگار کا اعزاز عطا کیا جبکہ ۲۰۱۳ء میں نیشنل بک فاؤنڈیشن نے انھیں سفیر کتاب کے منصب پر فائز کیا۔